

فسانہ



شرح چندہ
سالانہ دس روپیہ
عام شمارہ ایک روپیہ
خاص شمارہ ڈیڑھ روپیہ



رہنما
بلونت سنگھ

مُدیر
مسعود احمد

خطاط
سیّد احمد حسین

فسانہ میں شائع ہونے والے تمام ادبی یا نیم ادبی مواد میں نام، مقام، واقعات اور ادارے قطعی فرضی ہوتے ہیں اور حقیقی افراد، مقامات، واقعات، یا اداروں سے ان کی کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہے جس کے لئے ایڈیٹر، پبلشر یا مصنف پر کوئی ذمہ داری عاید نہیں ہوتی ——

دفتر فسانہ
۲۱۶ - دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد

ناظم :- عبد القدوس رومی
طابع وناشر :- مسعود احمد
مطبوعہ :- اسرار کریمی پریس الہ آباد
ٹائیٹل :- بہار گو پریس الہ آباد



صنم کدہ کی اوّلین پیشکش

بہو بیگم

- ہدایت :- ایم صادق
- نغمے :- ساحر
- موسیقی :- روشن
- کہانی :- جاں نثار اختر
- عکاسی :- ثریان ایرانی

سرزمین اودھ کی حویلیوں کی
داستان جن کے دروازوں
پر کبھی ہاتھی جھولتے تھے اور
نوبت بجا کرتی تھی — لیکن
آج گردش زمانہ کے ہاتھوں
اُن کے در و دیوار مسمار ہو چکے
ہیں اور عظیم کھنڈروں سے
حسرت برس رہی ہے۔

ستارے

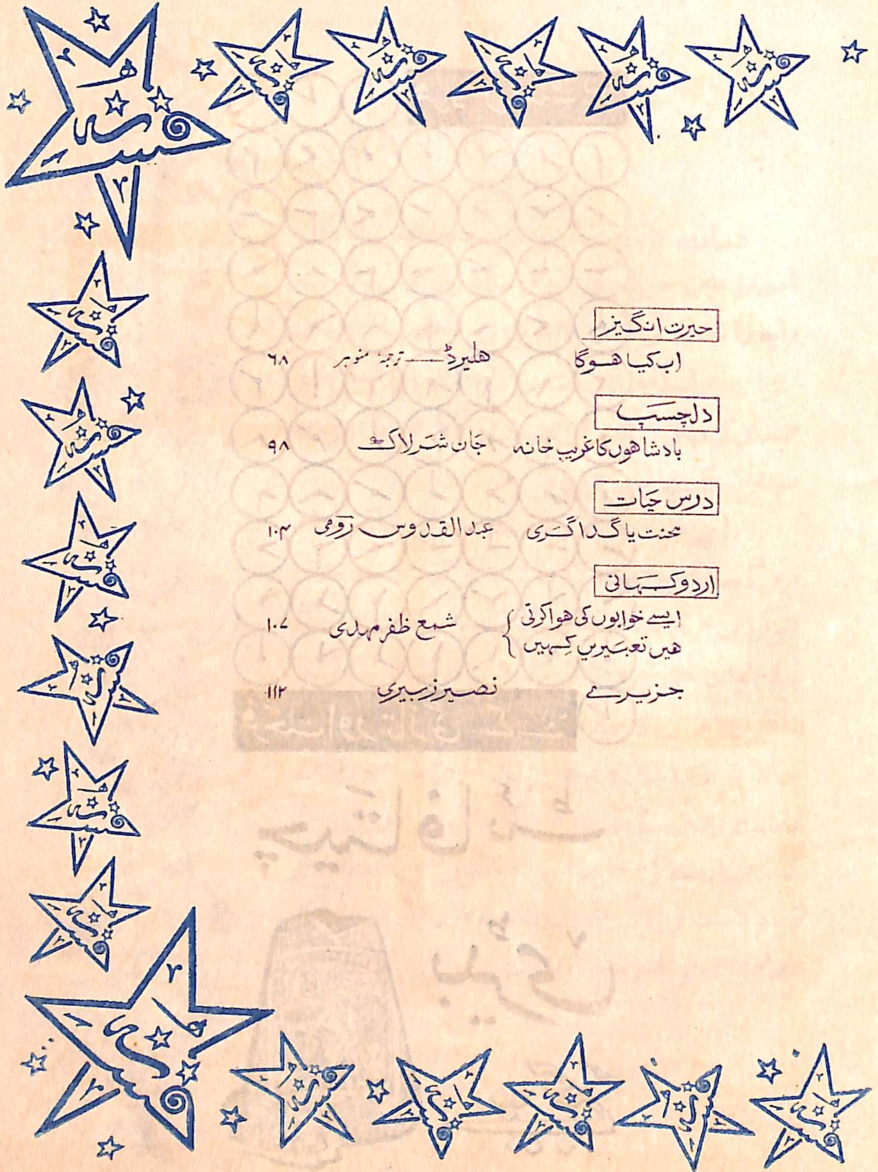
مینا کماری
اشوک کمار
پردیپ کمار

ایسٹ مین کلر میں

Collection of Shobhit Mahajan. Courtesy Sarai.


فہرست







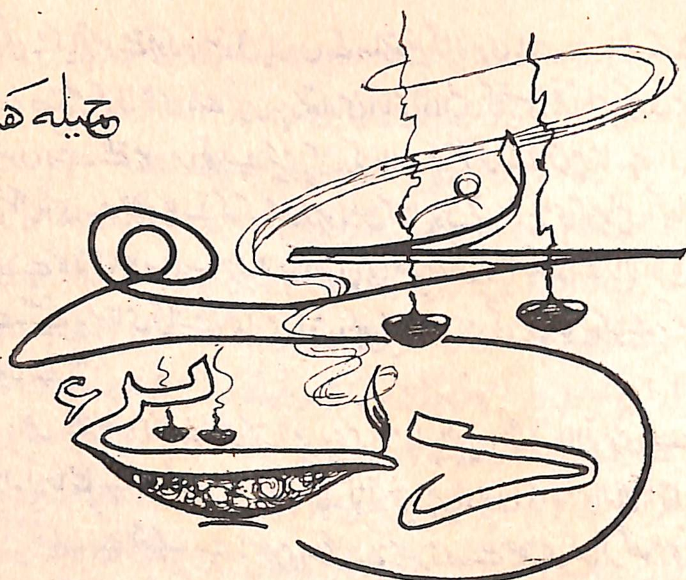
فسانہ کا تازہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس شمارہ میں جمیلہ ہاشمی کی سنگ میل کہانی "بجھے دیئے" واجدہ تبسم کی کہانی "کانچ کا دل" تامل کی کہانی "جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے" اور شمع ظفر مہدی کی کہانی "ایسے خوابوں کی ہوا کرتی ہیں تعبیریں" بہترین کہانیاں ہیں۔

ناظرین فسانہ کا مدت سے اصرار تھا کہ فسانہ میں کچھ تنوع پیدا کیا جائے اسی تقاضے سے متاثر ہو کر اس مرتبہ سے ہم ایک نیا سلسلہ "درس حیات" کے عنوان سے شروع کر رہے ہیں امید ہے کہ ناظرین اس کا خیر مقدم کریں گے اگر خدا نے چاہا تو ہم آئندہ بھی مزید تنوع کی صورتیں نکالتے رہیں گے ہاں اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہمارے کرم فرما اپنے حلقوں میں فسانہ کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے میں ہمارے ساتھ تعاون بھی فرماتے رہیں۔


ایک بات یاد رکھیے کہ
ICCO


NOORANI
TEL
نورانی تیل
नूरानी तेल
INDIAN
CHEMICAL Co.

جمیلہ ہاشمی



میں گھڑی گھڑی اپنے سیدھے ہاتھ کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا دو سال کے بعد میں اب اس سے روٹی کھا سکوں گا۔ دو سال کے مہینے، دو سال کی گھڑیاں، دو سال کے ہفتے اور دو سال کے پل یوں ہوتے ہوئے میرے سامنے سے کھسک رہے تھے جیسے برسات کے بادل جو چھا جائیں تو لگتا ہے کہ اب آکاش کبھی نہیں دکھے گا اور اندھیرا گہرا ہوگا اور بڑھے گا اور گرد کی ہر شے ہماری نظروں سے چھپ جائے گی۔

ہری سنگھ چاچا نے اپنی گھوڑی کی باگ کھینچ لی اور میں جو اپنے خیالوں میں ڈوبا الگوہ کی طرف جانے والے اکھڑے بکھڑے راستہ سے اس کے پیچھے آرہا تھا، گرتے گرتے بچا، میرا بازو پکڑ کر اُس نے زور سے ہلایا اور کہنے لگا۔

"یہ سپنے دیکھنے کی عادت عورتوں کو ملی ہے۔ مرد کام کرتا ہے، چوٹ کھانا جانتا ہے اور چوٹ مارنا۔ جیت سنگھ کو گرا کر تم ایسے اُداس ہو گئے ہو۔ کیوں یار بس یہی بل تھا۔ اگر اتنا چھوٹا دل ہوتا ہے تو عورتوں کے کپڑے پہن کر گھر بیٹھا کرو۔ میلوں ٹھیلوں میں آنے اور یاروں سے بَیر کمانے کی کیا ضرورت ہے؟"

میں نے بے بس ہو کر کہا۔ "چاچا تم جانتے ہو میں نے اُس سے بَیر نہیں کمایا تھا۔"

ہری سنگھ نے میرا بازو چھوڑ دیا اور چھڑی کو زور سے سر کے اوپر گھما کر گھوڑی کی گردن پر مار کر کہنے لگا۔ "بَیر کی ماں بہن کی ایسی تیسی۔" گھوڑی بے چین ہو کر ذرا سا گھومی اور

تیز چلنے لگی۔ "کیا تم سوچتے ہو کہ دوستوں یاروں کے ساتھ بیر کمانا بری بات ہے۔ بات کے لئے جان دے دینا بھی کوئی بڑی بات نہیں۔ پر تمھاری اُداسی کی ایسی کی تیسی، تم اُداس کیوں ہو۔ تم سپنے کیوں دیکھنے لگتے ہو۔ مرد تو اپنے بیری کو مار کر جان سے ختم کر کے خوش ہوتا ہے اور تمھاری شکل ایسی ہے جیسے جوتے کھا کر آئے ہو۔ میں کہتا ہوں تم اپنی پگڑی کو ہوا میں اُچھالو، زور زور سے گاؤ، ناچو۔ اوئے میں پوچھتا ہوں کیا جیت سنگھ کوئی جگ سے نرالا تھا یا تو نرالا ہے۔ بھتیجے یہ ہوتا ہی آیا ہے۔ ہماری طرف دیکھو، ہم نے زندگی میں کیا کچھ کیا ہے پر کبھی نہیں پچھتائے۔"

میں نے پھر اپنی طرفداری کرتے ہوئے کہا "چاچا جیت سنگھ سالا تو یونہی مجھ سے جھگڑ پڑا۔ تو جانتا ہے اُس کا میرا کتنا جوڑ تھا۔ تو تو خود ہمیں دیوں کی جوڑی کہا کرتا تھا۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" ہری سنگھ نے پھر زور سے چھڑی گھما کر گھوڑی کو مارتے ہوئے کہا۔ "میں کب کہتا ہوں تو اور جیت سنگھ دیوں کی جوڑی نہیں تھے۔ پر جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اس کی موت تیرے ہاتھ لکھی تھی اور بھلا تقدیر اگر اتنی زور آور نہ ہوتی تو تیری اور اس کی لڑائی ہی کیوں ہوتی۔ تو یہ قسم کیوں اٹھاتا کہ جب تک اسے مار نہ لے گا سیدھے ہاتھ سے کھانا نہ کھائے گا۔"

چاچے نے مُڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں بیٹا تقدیر کے سامنے کس کا زور چلا ہے۔ بھاؤ، تقدیر کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا۔ "جو ہونی" ہے اس کو کون رچا سکتا ہے۔ دریا کے کنارے بیٹھی دو لونی ڈھیریوں میں سے تاگے نکال کر ٹبتی اور پانی میں پھینکتی جاتی ہے۔ ہونی دیوی کے سامنے کس کی پیش گئی ہے۔ مرد کو تو ہونی کے لکھے کو کرنے کے بعد سپنا دیکھنا اور اُداس ہونا اچھا نہیں لگتا۔"

میں نے پھر کہا۔ "میں اُداس کب ہوں چاچا۔ سوچ رہا ہوں جیت سنگھ اگر مجھے خواہ مخواہ غصہ نہ دلاتا، میں اور وہ لڑ نہ پڑتے تو آج میں ان اُگھڑی بکھڑی راہوں سے پولس کے ڈر کے مارے بھاگ نہ رہا ہوتا۔ مجھے معلوم ہے، ہوگا تو وہی کہ پولس پھر کہیں نہ کہیں آ کر مجھے پکڑ لے جائے گی۔ مقدمہ چلے گا۔ سال دو سال چار سال، ہم کچہریوں کے چکر کاٹیں گے، سختیاں سہنی ہوں گی۔"

ہری سنگھ نے اپنی گھوڑی میرے برابر روک کر کہا۔ "سختیوں کے باوجود

کوئی شے ہے جسے انسان جیت کہتا ہے اور جو اس کی آنکھوں میں نشہ اور دل میں غرور بن کر سدا رہتی ہے اور جس کی سمجھ تم لوگوں کو نہیں ہے۔ چلو گھوڑی بڑھاؤ، اور تیز چلو۔"

میں اور ہری سنگھ چاچا دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔

شام کے نیلے دھندلکے میں ڈوبتی ہوئی آوازیں ہمارے گرد سونے لگی تھیں گھوڑیوں کے ٹاپوں کی آواز گونج بن کر پھیل رہی تھی اور ٹڈوں کی چر چر میرے جی کی اداسی کی طرح ہر شے کو چھو کر پلٹ رہی تھی۔ کھڑی فصلوں میں سے گزرتے اور چاند کی بکھری بکھری کرنوں کی طرح کھیتوں میں گم ہوتی پگڈنڈیوں کو ڈھونڈتے ہم نامعلوم راہ پر آگے ہی آگے جا رہے تھے۔ جب بالیں گھوڑیوں کے جسموں سے چھوتیں تو وہ کانپ کر آگے بڑھ جاتیں اور سرسر کرکے بہتی ہوا اپنی جگہ انھیں پھر لوٹا دیتی۔ ہم کھیتوں میں ڈوبی گھوڑیوں پر بیٹھے ہوئے دور دور تک پھیلی اور آکاش کو چھو کر آتی خاموشی میں دنیا کے آخری انسان لگ رہے تھے، چپ چاپ کسی منزل کے بنا چلتے ہوئے۔

ہری سنگھ چاچا پتہ نہیں مجھے کہاں لئے جاتا تھا۔ وہ بات بہت کم کرتا ہے اور کم بولنے والے سے لوگ یونہی دبنے لگتے ہیں۔ مگر اس کی چپ سے آج نہ جانے کیوں میرا جی گھبرا رہا تھا۔ شام کا اکیلا تارا ایک انگارے کی طرح ہمارے سروں سے دور آم کے درختوں کے اوپر چمک رہا تھا اور کوئل کہیں کوہو کوہو بولتی میرے جی کو دھچکے دے رہی تھی۔ پتہ نہیں ان راہوں سے لوٹنا کب نصیب ہو۔ کبھی کبھار آدمی کے پیچھے اس کے قدموں کو ہونی مٹا دیتی ہے۔ پھر وہ ان راہوں سے کبھی پلٹ نہیں سکتا۔ مجھے جیت سنگھ یاد آ رہا تھا۔ میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ اتنے سالوں اس کے لئے میں نے جو نفرت اپنے جی میں محسوس کی ہے وہ کہاں تھی؟ کیا جیت سنگھ کے اور میرے درمیان وہ بیر نہیں تھا جو دشمن کی موت کے بعد جی کو ٹھنڈک دیتا ہے اور جیت کی خوشی میں اپنی پگڑی اچھال کر خون سے بھرے ہاتھوں کو سر سے اوپر نچا کر ماہیا گا سکتا ہے؟ کیا میں عورتوں کی طرح سپنے دیکھ رہا تھا؟ میں گھبرا کیوں رہا تھا؟

ہری سنگھ نے کھلے میدان میں سے گزرتے ہوئے کہا۔ "سال چھ مہینے بیکانیر میں رہو گے تو لوگ جیت سنگھ کی موت کو بھول جائیں گے۔ وقت وقت کے دکھ کو بھلا دیتا ہے پھر تم پلٹ سکتے ہو۔

میں نے کہا وقت دقت کے دُکھ کو بھلا دیتا ہے چاچا پر بَیر کو نہیں -

ہری سنگھ نے پھر ہولے سے کہا تم شاید ٹھیک کہتے ہو۔ بَیر کو بُھلا کر ہم لوگ زندہ نہیں رہ سکتے ۔ قول کی طرح بیر کا پالن کرنا بھی ہمارے خون میں ہے ۔ پر چھ مہینے سال میں گاؤں کی ٹولیاں اور جوش سے بھرے برادری کے جوان جواب تیرے خون کے پیاسے ہیں، امن سے اپنے کاموں میں لگ کر دشمنی کو پرانا سمجھ لیں گے ۔ پھر غصّہ بھی کم ہو جائے گا تب تم آ جانا ۔

چاند نکل آیا تھا اور رات کی میٹھی ہوا شام کی نیلی دھول کو کب کی بٹھا چکی تھی، اور پانی سے بھری ٹھنڈک جسم کے ساتھ چھو جاتی تو سردی کی چادر سی بالنوں میں جھول اُٹھتی ۔ دل کو آپ سے آپ ایک تسلّی ہونے لگی ۔ دور کے گاؤں کی روشنیاں چاند کی روشنی میں پھیکی اور بجھی بجھی لگ رہی تھیں ۔ آبادی کے قریب سے کتّوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں، حویلیوں میں ٹمٹماتے دیئے آکاش میں دور دور چمکتے تاروں کی طرح لگ رہے تھے ۔ نیلاہٹ میں ڈوبے ہوئے اور ہولے ہولے ڈولتے ہوئے جیسے پانی پر ناؤ ہچکولے سے کھانے لگے ۔

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ " اگر ہم ساری رات یوں ہی چلتے رہے تو دو دن میں بھی بیکانیر نہیں پہنچ سکیں گے ۔ بھاؤ گھوڑی کو ذرا تیز بھگاؤ ۔ اب تو راستہ بھی سیدھا ہو گیا ہے "

مگر پتہ نہیں کیوں مجھ میں تھوڑی سی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی ۔ میلے کے آخری دن اُکھڑتی رونق میں ہم نے سارا دن مل کر شراب پی تھی اور ہاٹ ہاٹ پھر کر میلے میں گھومتی سوانیوں کو جی بھر کر تاکا تھا ۔ اور نئے سُنے ہوئے رسیلے گیتوں کو بار بار گایا تھا ۔ بھنگڑا ڈالتے ڈالتے تھک گئے تھے ۔

چیت سنگھ میری ماسی کا پوت اور گاؤں کا سب سے سجیلا جوان تھا ۔ وہ میرے ساتھ اکھاڑے میں اُترنا نہیں چاہتا تھا مگر اس کے یاروں کی ٹولی نے اُسے بھی آگے کر دیا تھا ۔ وہ اسے دھکیلتے ہوئے لائے تھے ۔ سارے گاؤں کو پتہ تھا کہ دو سال پہلے اسی میلے کے دن اس کی اور میری لڑائی ہو گئی تھی ۔ میری ٹولی والوں نے اُسے للکارا تھا ۔ شراب کے نشے نے ہمیں دُگنا بہادر اور نڈر کر دیا تھا اور پھر ہم گتھم گتھا

ہو گئے تھے۔ اصل میں ایسے ہی جان سے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ جس دن سے میں نے قسم اٹھائی تھی اور اپنے سیدھے ہاتھ سے روٹی کھانی چھوڑ رکھی تھی میرا دل کبھی کبھی اُداس ہو جاتا۔ مجھے اپنے کئے پر افسوس ہوتا تھا۔ چیت سنگھ کی اور میری یاری بہت پرانی تھی۔ وہ اور میں چھٹ پنے سے ہی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ عورت کے لئے لڑنا کتنی بیکار سی بات ہے اور پھر بھی اس کا اور میرا جھگڑا ایک عورت کے لئے ہوا تھا۔

بھلا سکھو اچھی تھی یا بری تھی تو اس سے ہم دونوں کو کیا فائدہ۔ سکھو گاؤں کی کہاں اور بڑی طرح دار مٹیار تھی۔ اس کی صورت پر کبھی چاند نہیں چمکا پر تہبند کو ڈھنگ سے باندھ کر پھنسی پھنسی کرتی پہن لیتی تو اس کے جسم سے آگ نکلنے لگتی۔ چیت سنگھ اور میں دونوں بہت دلنوں اس کی آنکھ سے بچ کر رہے پھر اس کی نظر چیت سنگھ کو کھا گئی۔

ہم دونوں میں سے کوئی بھی سکھو کے لئے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ "پر ہونی کو کون روک سکتا ہے" میرے جی میں گرہ پڑ گئی۔ ہم نے ایک دوسرے سے بولنا چھوڑ دیا ہے۔ جوانوں کی دو ٹولیاں بن گئیں۔ گاؤں بٹ گیا۔ میری ماں اور چیت سنگھ کی ماں بہت فکر مند رہنے لگیں۔ پہلے کھیتوں کو جاتے ہوئے وہ میرے گھر میں آتا۔ مجھے آواز دے کر ساتھ لے جاتا۔ گاؤں کی مٹیاریں دروازوں کی درزوں میں سے ہمیں جھانکتیں۔ بہوئیں گھونگھٹ کی اوٹ سے ہمیں دیکھتیں۔ پر ہماری یاری کو دنیا کی نظر لگ گئی۔

جب چیت سنگھ کو پچھاڑ کر میں نے اپنی چھری اس کے پیٹ میں اُتاری ہے تو میرا دل ڈوب سا گیا۔ ہری سنگھ نے میری بانہہ پکڑ کر مجھے گھسیٹ لیا اور شور کرتے گالیاں بکتے لوگوں کی بھیڑ میں سے نکال کر وہ مجھے میلے سے باہر لے آیا۔ دونوں گھوڑیاں سرسے رائیاں کی پچھلی طرف سے ہو کر اُجھے راہوں سے ہوتی بیکانیر کو جا رہی تھیں۔

چاند اونچا ہوتا جاتا تھا اور کبھی کبھی کوئی اکیلی کونج زور سے چیخ اُٹھتی۔ ماہیا گانے اور ڈھولک کے ساتھ اٹھتے گیتوں کی آواز اِدھر اُدھر سے آکر ہمارا راستہ کاٹتی گزر جاتی، پھر کوئل بولنے لگتی اور اس کی کوہو کوہو ہچکیوں کی طرح میرے دل کے اندر ڈوب جاتی۔ میرا دل بہت اُداس تھا۔ مجھے چیت سنگھ یاد آ رہا تھا۔

ہری سنگھ چاچا کی گھوڑی راہ میں کئی بار ٹھوکر کھاکر گرتے گرتے بچی۔ اور دن ہوتا تو وہ راہ کی ماں بہن کو گالیاں دیتا مگر آج رات جب میں اور وہ بیکانیر جا رہے تھے، اس کو گالی یاد نہ تھی۔ پتہ نہیں اسے کیا کیا یاد آ رہا تھا۔ مجھے گھر یاد آ رہا تھا۔ آنگن میں سے پلٹ پلٹ کر جاتی اور پھر لوٹ کر آتی اپنی ماں یاد آ رہی تھی۔ گلی کا دروازہ کھول کر باہر جھانکتی جیتو اور اسے بلاتی ہوئی دادی اور اس کا سفید بالوں سے بھرا سر یاد آ رہا تھا۔ سنتو جو کوٹھری میں باہر کی آہٹ پر کان لگائے بچوں کو سلا رہی ہوگی اور مٹی پر ہاتھ دھرے دھرے کانپ کانپ کر سوچ رہی ہوگی ”میلے سے پلٹنے والے پتہ نہیں کب گھر پہنچیں گے“۔ اسے کیا پتہ اب میں کب گھر آؤں گا؟

مجھے ماں اور جیتو، دادی اور سنتو سب پر رحم آ رہا تھا۔ پتہ نہیں ان کا کیا حال ہوگا۔ ریتے والا اور کاٹیاں کے درمیان بہنے والی نہر کے پاس پہنچ کر میں نے کہا ”چاچا کیوں نہ ہم پلٹ چلیں اور آدمیوں کی طرح کئے ہوئے کام کا نتیجہ بھگتیں؟“

ہری سنگھ نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا اور میرا کندھا ہلا کر کہنے لگا۔ ”تم کو ان حرفوں نے خراب کیا ہے جو منشی جی کے پاس تم نے مدرسے میں پڑھے۔ تم گاؤں کو نہیں بدل سکتے۔ تم زندگی اور پرانی ڈگر کو نہیں بدل سکتے۔ سب کچھ ویسے ہی رہے گا بھتیجے۔ بدلہ لینا اور آپ کو بچانا یہ دونوں کام ہمیں کرنا ہوں گے سمجھے۔ چپکے میرے پیچھے چلے آؤ۔ تمہاری عقل کی ماں کی ایسی تیسی۔ تم اب گاؤں میں میری ہنسی اڑواؤ گے۔ میرا بھتیجا اور جیت سنگھ کی ٹولی کے ہاتھ بری موت مرے۔ نہیں بھاؤ۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم نے بہت کچھ سہا ہے۔ تم سے زیادہ کڑی زندگی گزاری ہے۔ بہت کچھ آن کی بھینٹ کیا ہے۔ پوری زندگی چند گھڑیوں کی بھینٹ ہے۔ ایک بری نظر کا بدلہ بھی لیا ہے۔ ہم نے بہت کچھ کھو دیا ہے بھاؤ۔ اور تم ایک دوستی کو روتے ہو۔ تم لوگ بیر کا پالن نہیں کر سکتے تو قول کا کیا کرو گے۔ تم لوگ مرتے جاتے ہو۔ تمہارا خون ہولے ہولے ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تمہارے جی کو نہ یاری کا خیال ہے اور نہ دشمنی کا۔“

میں نے جل کر کہا۔ ”چاچا کیا آج میں نے جیت سنگھ کو نہیں مارا؟“

ہری سنگھ نے مڑ کر کہا۔ ”اور پھر سوانیوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو۔ واپس جاکر اس کی ارتھی کو کندھا دے شمشان لے جانا چاہنا یہ کیا ہوا؟“

میں نے کہا چاچا تم غلط کہتے ہو۔ ہم ہر شئے سے لڑ جاتے ہیں۔ میں آنسو نہیں بہا رہا۔ مجھے گھر چھٹنے کا دکھ ہے۔

ہری سنگھ نے پھر ذرا ہنس کر کہا۔ "گھر کی محبت! گھر میں تمھاری ماں ہو گی بہن ہو گی، بیوی ہو گی؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ "اور اگر میں تمھیں ایسے ایسے آدمیوں کا نشان دوں جنھوں نے بہنوں، ماؤں اور بیویوں کو قتل کر دیا۔ گھر کو آن پر قربان کر دیا۔"

"سنو چاچا" میں نے کہا۔ "آج میں بیکانیر کی طرف نکل جاؤں گا اور پھر پتہ نہیں کب پلٹ کر آؤں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ پیار اور لگاؤ سمیت کسی کو مارنا کٹھن نہیں ہے؟"

"کٹھن۔ کٹھن؟ یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو بھاؤ۔ یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟ ہری سنگھ چاچا نے اپنے دل پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا۔ اتنی یادوں کا بوجھ دل پر لئے لئے زندہ رہنا کبھی کبھار بہت لگنے لگتا ہے بھتیجے۔ تمھیں کیا پتہ میں نے زندگی میں کیا کچھ سہا ہے۔ کیا کچھ کھو دیا ہے۔ کتنے پیار اپنے ہاتھوں دھرتی میں ملائے ہیں۔ تمھیں کیا پتہ ہے چاتن تمھیں کیا پتہ ہے۔ تمھارے پاس یہ آس تو ہے کہ سال چھ مہینوں کو لوٹ کر آؤ گے تو تمھارے گھر کے دروازے کھلے ہوں گے۔ حویلی میں تمھاری ماں اور دادی تمھیں دیکھ کر سینے سے لگا لیں گی۔ تمھاری بہن تم پر سے واری ہونے کے لئے اپنا دل بھی نکال کر تمھارے قدموں میں رکھ دے گی۔ تمھاری بیوی گھونگھٹ کو ماتھے تک کھینچے کھینچے آنگن میں آکر تمھیں ایک نظر دیکھے گی۔ تمھاری لڑکیاں تمھاری ٹانگوں سے چمٹ جائیں گی۔ تم مر نہیں سکتے چاتن۔ دنیا کے رستے بستے دل میں تمھارا حصّہ ہے۔ پر میری طرف دیکھو۔"

میں نے چاند کی کرنوں کے بہتے دھارے میں ہری سنگھ کی طرف دیکھا۔ اس کی سفید داڑھی پر آنسو چمک رہے تھے اور آنکھیں اندر دھنسی ہوئی اور بے نور لگتی تھیں۔ اس نے باگیں چھوڑ دی تھیں اور گھوڑی اُن مَنے دل سے اجنبی راہوں پر بیگانوں کی طرح ایک ایک قدم چل رہی تھی۔ اور چاتن یوں بیٹھا تھا جیسے اُسے کہیں جانا نہ ہو۔ میلے کا شور بہت دور پیچھے رہ گیا تھا۔ پہلے میلے سے پلٹتے ہمارے ساتھ نئی خریدی ہوئی گھوڑیاں

ہوتی تھیں۔ ہانپتی اور تیز دوڑتی ہوئی ایک ایک دو دو کی ٹولیوں میں بٹ کر ہم باتیں کرتے اور شراب کی بوتلیں بانٹ بانٹ کر پیتے اور ٹھٹھا کرتے ہوئے گاؤں کو لوٹتے۔ آج میں اور ہری سنگھ چاچا گاؤں سے اُلٹی طرف جا رہے تھے۔ چاچا بھی اُداس تھا۔

"چاتن تمھاری ماں کی طرح اگر میری ماں بھی ہوتی تو آج دل پہ ہاتھ دھرے ڈوبتی جان کے ساتھ تمھیں بیکانیر کی راہ دکھاتا اور مردوں کی طرح ہر مصیبت کا مقابلہ کرنے کی نصیحت کرتا۔ آپ اتنا اُداس نہ ہو جاتا۔ تم بھی کہو گے میں اتنا بوڑھا ہو کر بھی ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ سفید بالوں اور بیتے سالوں کا بوجھ اُٹھائے اُٹھائے ایک زمانہ گزر گیا ہے چاتن اور پھر بھی میں ماں کو یاد کر رہا ہوں۔ تم اس کو میرے دماغ کی خرابی کہو گے۔ تم سوچو گے میں پاگل ہوں۔"

میں نے ہولے سے کہا۔ "نہیں چاچا میں تمھیں پاگل نہیں سمجھتا۔ میں تمھیں غلط بھی نہیں کہتا۔ مجھے تمھاری بات پر اعتبار ہے۔"

ہری سنگھ نے پھر کہا۔ "اعتبار کرو یا نہ کرو بھتیجے۔ پر یہ باتیں میں تمھیں ضرور کہوں گا تاکہ تمھیں معلوم ہو کہ زندگی میں کیا کچھ سہنا پڑتا ہے اور کسی کسی آتما میں اتنے گہرے گھاؤ ہوتے ہیں جسے نہ خوشی ہی بھر سکتی ہے اور نہ ہی گزرتا وقت۔

"چاچا!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا۔ "میں نے زندگی کا ابھی کچھ نہیں دیکھا پر پتہ نہیں کیوں جیت سنگھ کا پیار میرے جی میں لوٹ آیا ہے۔ وہ نہیں ہے اور میں سوچتا ہوں اگر وہ ہوتا تو آج ہم سکھو کو بیچ میں سے نکال کر پھر صلح کر لیتے۔ پچھلے دنوں کی طرح پھر گلے میں باہیں ڈال کر چلتے اور دیوں کی جوڑی کہلاتے۔"

ہری سنگھ نے ٹھنڈی سانس بھری، کہنے لگا۔ "ابھی رات باقی ہے، سرحد کونسی دور ہے آؤ اس اُجاڑ کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ جائیں، میں تمھیں اپنا دُکھ سنا ہی دوں تاکہ تمھارے جی کو تسلی ہو کہ لوگ جیت سنگھ سے بھی پیاری چیزیں اپنے ہاتھوں برباد کر سکتے ہیں۔"

میں کھوہ کی منڈیر پر بیٹھ گیا جو کہیں کہیں سے اینٹوں کے اُکھڑے ہونے کی وجہ سے بہت پرانی لگ رہی تھی۔ درزوں میں اُگے پیپل کے پتے چاندنی میں چمک رہے تھے اور ہوا شاخوں میں سن سن کر کے گزر رہی تھی۔ ہم نے گھوڑیوں کے رسے گرے ہوئے ستون کی ایک مضبوط اینٹ میں پھنسا دیے۔ ایک اُلّو چیختا ہوا ہمارے سروں پر سے گزر گیا۔

ہری سنگھ نے کہا "کھوہ اور گھر تب اُجڑتے ہیں جب ان کو چلانے والا باقی رہے۔
ماں کے بعد ہمارے گھر کا بھی یہی حال ہوا تھا۔ پریتو کو پالنے اور سنبھالنے کا سارا بوجھ میرے اور باپو کے سر پر آپڑا۔ میری ماں نے بہت دُکھ سہے ہیں۔ پر وہ دیئے کی لو کی طرح بھڑک کر بُجھ نہیں گئی۔ چُپکے چُپکے، ہولے ہولے گھُل گئی۔ باپو کی طبیعت کی سختی نے اُسے برباد کیا ہے۔ اُس کی طبع بڑی نازک تھی۔ بیل بیمار ہوتے تو وہ پریشان ہو جایا کرتی تھی۔ کسی کی تکلیف اُس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ آپ دُکھ اُٹھاؤ تو دوسرے کے دُکھ کی قدر ہوتی ہے پر کئی تکلیفیں انسان کو پتھر بنا دیتی ہیں۔ ماں کا دل سورگ بن گیا تھا۔ میری ماں بہت بڑی عورت تھی چانن، بڑی اور اونچی عورت۔ اس نے کبھی کسی سے شکایت نہیں کی۔ کبھی روئی نہیں، باپو کی جوانی میں اُس نے سوکنوں کے نخرے اُٹھائے ہیں۔ رات رات بھر کھڑی رہی ہے، دھوپ کی سختیاں سہی ہیں۔ پوہ کی راتیں باہر بیٹھ کر کاٹی ہیں۔ اور جب میں جوان ہوا تو پریتو کو چھوڑ کر وہ چلی گئی جیسے اس ستون کے پیچھے چھپ گئی ہو۔ مجھے آج بھی یقین نہیں کہ وہ مر گئی تھی۔ اُس نے بہت کچھ سہا ہے۔ اُس میں اور بہت کچھ سہنے کی طاقت تھی۔ میں کیسے مان لوں کہ وہ مر گئی۔ اگر تمہیں میں ماں کی تکلیفوں کا حال سُنانے بیٹھوں تو یہ رات ساری بیت جائے گی۔ اُس سے اگلی رات بیت جائے گی اور اُس سے اگلی بھی۔ پھر اُس کے دُکھ کی کہانیاں مجھے سچی نہیں لگتیں۔ وہ باتیں میں نے دوسروں سے سُنی ہیں۔ بھلا اکیلی اور کمزور سی کم بولنے والی عورت کتنا کچھ سہہ سکتی ہے۔ پریتو کو چھوڑ کر وہ مری ہے تو میں اور باپو دونوں اکیلے رہ گئے۔ اور دونوں کے کندھوں پر پریتو کو پالنے کا بوجھ پڑ گیا۔ ماں کے مائیکے گھر کے لوگ لڑکی کو لے جانا چاہتے تھے پر باپو کا دل پتہ نہیں کیوں ایکا ایکی اتنا نرم ہو گیا تھا۔ اُسے ماں کو دی ہوئی تکلیفیں یاد آتی تھیں اور وہ پریتو کو اپنے سے جُدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ پریتو ہمارے سامنے بڑی ہوئی ہے۔ میری پوروں میں اُس کے جسم کی نرمی ہے، میرے دل میں آج بھی اس کا پیار ہے۔ ایسا نہیں جیسا ایک بھائی کو عام زندگی میں ایک بہن سے ہوتا ہے۔ مجھے لگتا تھا میرا جسم ایک درخت تھا اور وہ میری ایک شاخ تھی۔ اس کے ٹوٹ جانے کا گھاؤ کبھی نہیں بھرے گا۔ چانن سنگھ وہ شاخ ٹوٹ کر اپنا نشان چھوڑ گئی ہے۔ پریتو ایک چاند تھی جس سے میری زندگی کی تپن میں

ذراسی ٹھنڈک ہوتی تھی۔ میں ماں کا بدلہ باپو سے نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا ابھی کیا رشتہ تھا؟ میں نے پریتو کو پوجا ہے۔ گرنتھ کی طرح پوتر اور آتما کی طرح میرے سانس کی ڈوری اُس میں اٹکی ہوئی تھی۔

وہ بڑی ہوتی گئی تو ہمارے گھر میں مانو بہار آنے لگی۔ باپو سکھ کا سانس لینے لگا۔ میں باہر سے آتا تو وہ دوڑ کر میری ٹانگوں سے لپٹ جاتی۔ میں چارے کا گٹھا زمین پر پھینک کر سب سے پہلے اُسے اپنے بازوؤں میں اُٹھا لیتا۔ اس کا سر اپنے سینے سے لگا کر میرا دل کیسا ہلکا ہلکا لہروں پر ڈولنے لگتا۔ چانن تمہیں کیا بتاؤں وہ کیا شے تھی۔ اس کی باتیں ذرا ذرا سی ساری مجھے ایک ایک کر کے یاد ہیں۔ چاہو تو میں تمہیں ایک ایک دن کی ساری باتیں سُنا دوں۔

وہ ذراسی اونچی ہوئی تو گھر میں ساری چیزیں ٹھکانے سے نظر آنے لگیں چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے روٹیاں پکا کر جب وہ مجھے اور باپو کو کھلاتی تو ہمیں اپنے سے زیادہ خوش اور کوئی دکھائی نہ دیتا۔ چھوٹی چھوٹی انگلیوں میں تاگے کا تار پکڑے اس نے چرخہ بھی کاتا ہے، کمزور باہوں سے دودھ بھی بلویا ہے۔ چانن پتہ نہیں اُس میں اتنی طاقت کہاں سے تھی بھلا دس سال کی لڑکی کیا کچھ کر سکتی ہے؟

اور بڑی ہوئی تو اس نے بڑا روپ نکالا۔ تتلی سی آنگن میں اِدھر سے اُدھر گھومتی پھرتی اور کام کرتی رہتی۔ رات کو تھک کر بیٹھتی تو مجھ سے اب کہانیاں بھی نہ سُنتی۔ میں کہتا۔ "پریتو تو اب پریوں کی کہانی نہیں سُنے گی"۔ تو ہنس کر کہتی۔ "ویر بھلا اب میں کہانیاں سُننے جنتی ہوں۔ اب تو میں بہت بڑی ہو گئی ہوں۔ میلے پر جاتا تو میں اس کے لئے رنگ برنگ چوڑیاں، مٹھائی اور کوئی کام کی شے ضرور لاتا۔

چوڑیاں بھی کیا شے ہے چانن، عورت پہن لے تو وہ گیت بن جاتی ہے۔ ہولے ہولے چھن چھن کرتی، ایک دوسرے سے ٹکرا کر راگ پیدا کرتی چوڑیاں عجیب چیز ہیں۔ کانچ کی چوڑیاں جیسے سات سُروں کو کسی نے بانہہ میں پرو دیا ہو۔

ہری سنگھ چُپ ہو گیا جیسے بہت سی باتوں کے بوجھ تلے دبا سسک رہا ہو۔ رات بیتی جا رہی تھی۔ چاند کے سامنے سے سفید بادلوں کے ٹکڑے ذرا ذرا سے پرندوں کی طرح اُڑ اُڑ کر ہوا کے زور سے بکھر رہے تھے۔ "میلے پر جانے کی ایک شام مجھے

بہت اچھی طرح یاد ہے۔ پرتیتو نے حلوہ پکایا تھا اور پراٹھے پکا کر میرے لئے اپنے ہاتھوں سے کاڑھے ہوئے ایک رومال میں باندھے تھے۔ جب میں نے پگڑی کو کس کس کر باندھا تو میرے پاس کھڑی ابرق کو اکٹھا کرتی رہی۔ پھر اس نے میرے سر پر سے ماش وارے۔ میں نے کہا پرتیتو تجھے یہ باتیں کہاں سے آئی ہیں تو کہنے لگی: "مجھے اور بھی بڑی باتیں پتہ ہیں ویر' اس طرح سے نظر نہیں لگتی۔"

میں نے شام سے پہلے پہلے ہی گھوڑیاں تیار کر کے اور سامان لاد کر اونٹوں کو پیارا سنگھ کے ساتھ میلے میں بھجوا دیا تھا۔ پرتیتو کہنے لگی "ویر میرے لئے میلے میں سے ڈھیر ساری رنگ برنگی چوڑیاں لانا' مٹھائی بھی اور ایک پینگوں والی چیز بھی۔" جب میں دروازے میں سے نکلا ہوں تو بوڑھی ماسی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا۔ "وے چاتن میرے لئے کرتے کا کپڑا لانا۔" پرتیتو کو میں نے ماسی سے کبھی زور سے بولتے نہیں سُنا پر اُس دن چیخ کر کہنے لگی۔ "ماسی بھلا جاتے ہوئے کسی کو آواز دیتے ہیں' تو بھی پاگل ہی ہے' سُکھ سے میرا ویر گیا ہے سُکھ سے لوٹ کر آئے۔" میں نے مُڑ کر دونوں کو دیکھا اور ہنس پڑا۔ پرتیتو کو کتنی عقل آ گئی تھی۔

شام نے مجھے سکھے کھیڑے سے اِدھر ہی آ لیا۔ کالے بادل آگے پیچھے بڑھتی فوجوں کی طرح اکٹھے ہو گئے۔ اور جب میں اپنے گاؤں سے دو کوس گیا تھا تو مجھے یاد آیا کہ میں نے جلدی میں اپنا کھیس بھی نہیں لیا اور نہ ہی بڑی کرپان لی ہے۔ یہ سوچتے سوچتے میں سکھے کھیڑے جا پہنچا۔ میلے میں جانے والے لوگ گدھوں پر' گھوڑیوں پر' اونٹوں پر ایک ایک دو دو جا رہے تھے۔ گھوڑیوں کے پاؤں میں پڑے گھنگرو چھن چھن کرتے ہوئے ماہیا گانے والوں کی لَے میں رَس سا گھولتے۔ اونٹیاں بھاری قدموں سے تیز تیز چلتی ہوئی مستانی چال سے جھولتی ہوئی اوپر بیٹھے اور راگوں میں بہنے والے دھارے میں لوچ پیدا کرتی ہوئی آگے ہی آگے جا رہی تھیں۔ گڈوں کے نیچے بتیاں جل رہی تھیں اور جوان بیلوں کے دودھیا پنڈے بادلوں کو چیر کر چاندی کی کرنوں میں جگ مگ کرتے جیسے کسی کنواری کا دمکتا ہوا بدن ہو۔ جوان ہوتے لڑکے شور کر رہے تھے اور جانوروں کی بولیاں بول رہے تھے۔ گھوڑے دوڑا کر آگے نکلنے والے لڑکوں کو میلے کی خوشی اور زندگی کا نیا پن شراب کے نشے کی طرح مدہوش کر رہا تھا۔ اُجاڑ راہیں آباد تھیں اور گرو کے نام کا نعرہ

درختوں کے نیچے کچے راستوں اور چھوٹی راہوں پر زور سے گونج اُٹھتا۔

میں نے سوچا کیوں نہ واپس جاکر کھیس لے آؤں۔ کرپان کے بنا میلے میں جانا بھی بھلا نہیں لگتا۔ لوگوں سے یوں ہی ٹکرا جانا، ذرا ذرا سی باتوں پر لڑنے لگنا میری عادت نہیں۔ اور پھر یہ کوئی مردمی تو نہیں کہ کرپان ہاتھ میں ہو تو ساری دنیا تمہیں کیڑے مکوڑے کی طرح لگے۔

میں نے کہا چاچا میں نے تو ایسا نہیں سوچا تھا۔ جیت سنگھ مجھ سے تگڑا جوان تھا۔ اور تمہیں پتہ ہے اس نے کبھی کسی سے پچھاڑ نہیں کھائی، کسی سے دبا نہیں۔

ہری سنگھ نے میرے کندھے پر ہاتھ دھر کر کہا "پر جوان میں نے یہ کب کہا ہے کہ تو نے جیت سنگھ کو کمزور سمجھ کر مارا ہے۔ میں تو اپنی بات کر رہا تھا۔ میلے میں کرپان نہ ہو تو آدمی خالی خالی لگتا ہے جیسے سوتے سے اُٹھ کر چلا آیا ہو۔ پگڑی کا ابرق اور تہبند کے لڑ کرتے کے رنگ اور جوتی کی اوپر کو اُٹھی نوک سب کمین کی اکڑ لگتے ہیں۔ سکھے کھیڑے میں میرے پہنچنے سے پہلے ہی میرے یار میلے کے لئے جا چکے تھے۔ حویلیوں میں دئے جل رہے تھے۔ اور بوڑھے کہار آگ تاپتے ہوئے ایک ایک دو دو پرانے سرداروں کے قصے سُنا رہے تھے۔ عورتیں باہر سے لوٹ رہی تھیں اور جوان لڑکیاں زور زور سے باتیں کرتی کھڑ کھڑ ہنس رہی تھیں۔ میں نے اپنی باگیں کھینچیں اور گھوڑی کو دوڑاتا گاؤں پلٹ آیا کہ کھیس اور کرپان لے کر پھر جاؤں گا۔

گلیوں میں خاموشی تھی۔ تیز ہوا کے ساتھ پتے اور گرد اُڑ رہی تھی۔ بادل سکھتے کھیڑے کی طرف چلے گئے تھے اور ہمارے گاؤں پر چاند ہولے ہولے نیلے پانی میں کشتی کی طرح تیر رہا تھا جیسے سفید بطخ اکیلی جوہڑ کے میلے پانی پر ہو۔ پتہ نہیں کون سی طاقت تھی جو مجھے واپس لائی تھی۔ گھر کی دیوار کے ساتھ نیم کا ایک پُرانا درخت ہے۔ اب تو اس کی شاخیں آنگن میں بہت اندر کی طرف جھک آئی ہیں۔ اور دیوار میں بڑی درز پڑ گئی ہے۔ ان دنوں نیم کی ڈالیاں دیوار سے اندر کی طرف جھکی جھکی اور نرم تھیں اور آدمی آرام سے اُس پر سے کود کر بنا آواز پیدا کئے آنگن میں اُتر سکتا تھا۔ میں نے گھوڑی کو نیم کے ساتھ باہر باندھ دیا اور دیر ہو جانے کے ڈر سے کود کر اندر چلا گیا۔ بوڑھی ماسی رضائی میں مُنہ دئے دیے باریک

خراٹے لے رہی تھی۔ سانس کے ساتھ اُس کے گلے میں بلغم غرغر کرتی۔ دیا جل رہا تھا اور پریتو کا پلنگ خالی تھا۔ پہلے میں نے سوچا ماسی کو جگا کر اُس سے اتا پتہ پوچھوں میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دیا لے جا کر دوسری کوٹھری میں رکھ دیا اور آپ اسی راہ سے باہر آ گیا۔

میرا خون کھول رہا تھا، میرا دل پاگل ہو رہا تھا۔ سردی کے باوجود مجھے پسینہ آ رہا تھا۔ پریتو کے لئے پیار کی تہوں میں چھپا پتہ نہیں کب کا دبا غصہ میری نس نس میں میں گھوم رہا تھا۔ میں کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ میں پریتو کو زور سے پکارنا چاہتا تھا۔ اتنی زور سے کہ میلے کو جاتے لوگ رک جائیں اور مجھے پوچھیں کیوں کیا بات ہے ؟

کھیتوں کی اونچی منڈیروں اور شہتوت کے خوشبو دار مٹھاس سے بھرے درختوں سے ٹکرا کر میری آواز لوٹ آئے اور پریتو اُس کے ساتھ ساتھ اُڑتی میرے پاس آ جائے۔ کبھی کبھار دماغ بھی کیسی اَن ہونی باتیں سوچتا ہے۔

گھوڑی کو میں نے ایک اُجاڑ کھوہ پہ باندھ دیا۔ میں دوڑ رہا تھا۔ میرا سانس پھول رہا تھا۔ پتہ نہیں کون شئے تھی جو مجھے آگے بڑھا رہی تھی۔ میں زندہ تھا میرا سانس سانس چل رہا تھا۔ کبھوں چاٹن کیا تو نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ ایسی گھڑی تمھارے سر پہ ہے جب اس کے بوجھ سے تمھارا دم بند ہو سکتا ہے۔ تم موت اور جینے کے درمیان کسی ایسی حد پہ تڑپ رہے ہوتے ہو جو حد تم چھو نہیں سکتے، اُس حد کا کوئی نام نہیں۔

پھر میں نے پریتو کو دیکھا۔ وہ اور جوالا سنگھ ایک درخت کے پاس کھڑے تھے جو ذرا اوٹ میں تھا اور اونچے کھیت کی وجہ سے نظر بھی کم ہی آتا تھا۔ پریتو کے بعد میں نے وہ درخت آپ کاٹ دیا تھا۔

"کون جوالا سنگھ ؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"اوئے بھئی وہی جوالا سنگھ جو میری ماسی کا پوت تھا۔ جس کا گھر تمھارے گھروں کے ختم ہوتے ہی گلی کے دوسرے سرے پہ ہے۔ جس میں چنت کور رہتی ہے۔" ہری سنگھ نے بڑی بیزاری سے جواب دیا۔

"اچھا اچھا سمجھ آ گئی۔ میں وہ دوسرا جوالا سنگھ سمجھ رہا تھا۔ ہرنام سنگھ کا سالا۔" میں نے بڑی آسانی سے جواب دیا۔

"تم سوچتے ہو میری بہن سے بات کرنے والا، میری چوری چھپے اس سے ملنے والا آدمی آج تک زندہ ہو سکتا ہے۔ تم مجھے کیا سمجھتے ہو بھتیجے؟ کیا تم کو یہ یقین ہے کہ اُس رات جب میں میلے پر جانے کے لئے گھر سے چلا گیا تھا اور پرتیو اُس سے ملنے اس شرین کے پاس کھڑی تھی، میں نے جوالا سنگھ کو زندہ رہنے کے چھوڑ دیا ہوگا؟

پرتیو اسے کہہ رہی تھی۔" جوالا سنگھ تو میرے ویر کی طرح سُندر نہیں اور نہ ہی میرے باپو کی طرح بہادر ہے پر پھر بھی تو مجھے اچھا لگتا ہے۔

جوالا سنگھ نے کہا۔"ایسی باتیں تو ہر عورت کسی نہ کسی مرد سے کہتی ہے۔ مزہ تو تب ہے کہ تو زندگی میں ہی نہیں موت میں بھی میرا ساتھ دے۔ سدا سدا کے لئے مجھ سے نباہ کرے۔

اور پرتیو نے اس کے بازو پر ہاتھ دھر کر کہا" اچھا جوالا سنگھ میرا تیرا قول رہا۔ میں موت میں بھی تیرا ساتھ دوں گی۔"

وہ موت سے کتنے قریب تھے۔ میں کھیت کی اوٹ میں اُن کے پیچھے کھڑا رہا۔

پہلے میرا جی چاہا کہ میں کرپان کا ہاتھ لمبا کرکے ماروں اور اُن دونوں کو وہیں گرا دوں۔ پھر میں کچھ سوچ کر پلٹ آیا۔ میں گھر میں پرتیو کے پلنگ میں لیٹ کر اُس کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ایک آہٹ پر میں چونک جاتا۔ وقت جوں کی چال چل رہا تھا۔ کھسکتا ہوا بھی نہیں لگتا تھا۔

بہت دیر کے بعد ذرا سا کھٹکا ہوا۔ جیسے کوئی بلی آنگن میں کودے۔ پھر سانس روکے پنجے کے بل چلتی پرتیو اندر آئی۔ اس نے ٹٹول کر اپنا پلنگ ڈھونڈا۔ جس پر موت اس کا انتظار کر رہی تھی۔ موت بھی محبت کی طرح زبردست ہے۔

جب میں نے اس کا ہاتھ پکڑا ہے تو وہ ٹھنڈا تھا۔ میں اُسے گھسیٹتا ہوا دوسری کوٹھری میں لے آیا۔ وہ میرے ساتھ یوں کھنچی چلی آئی جیسے اُس میں جان نہ ہو۔ دیئے کی لو کو اونچا کرکے میں نے اُسے کہا۔

"سچ بتا تو کب سے جوالا سے ملتی ہے؟"

مگر اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سر نیچا کئے بیٹھ گئی اور آخر تک اُسی طرح بیٹھی رہی۔ میرا جی دَم دَم آگ ہو رہا تھا۔ میں اونچی آواز سے بول بھی نہیں رہا تھا۔

کوٹھری میں ہماری آواز کی گونج بیں تھی۔ یوں لگتا تھا ہم دونوں سانس بھی نہیں لے رہے تھے۔ جب میں نے کہا "اُس جوالا سنگھ سے بھی نمٹ لوں گا" تو پریتو نے سر اونچا کر کے مجھے دیکھا اور کہنے لگی "دیر اُس کا کوئی قصور نہیں۔"

میں نے دانت پیس کر کہا "اچھا اُس کا کوئی قصور نہیں تو نہ سہی" پھر میں نے کرپان کے ایک ہی ہاتھ سے اُس کا سر تن سے جُدا کر دیا۔ اُس کا جسم تھوڑی دیر تڑپا اور پھر ہولے ہولے ٹھنڈا ہو گیا۔ میں نے اس کے ٹکڑے کئے اور بوری میں بند کر کے اناج کی کوٹھری میں رکھ دئے۔ آنگن میں دبے قدموں چلتا میں نیم کے راستے گلی میں آ گیا۔

چنت کور کے گھر میں جو پیپل ہے وہ اُن دنوں اتنا اونچا نہ تھا۔ دیوار کے برابر اگر کسی طرح باہر کی طرف سے چڑھ جاؤ تو اندر جانے میں آسانی رہتی ہے۔ جب میں نے اندر جا کر جوالا سنگھ کی کوٹھری کا دروازہ کھٹکھٹایا ہے تو میرا دل بڑا شانت تھا۔ ٹھنڈا اور کام کرنے کے لئے تیار۔ جوالا سنگھ نے کرتا نہیں پہنا ہوا تھا۔ دونوں بغلوں میں ہاتھ دبئے جب اُس نے "کون ہے؟" کہہ کر دروازہ کھولا تو میں موت بن کر اُس پر جھپٹ پڑا۔ میں نے اُسے ہلنے اور بولنے کا وقت بھی نہ دیا۔ اپنی پگڑی سے میں نے اُس کے ہاتھ پیر اچھی طرح جکڑ دئے۔ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا کہ وہ ہل اور بول نہ سکے۔

بخشی ابھی تک سو رہی تھی۔ بخشی میری پریتو کی بڑی سہیلی تھی۔ جوالا سنگھ کی ماں کے مرنے کے دوسرے مہینے برادری کی سب سے چھوٹی لڑکی کو چاچے کرتار سنگھ نے جوالا سنگھ کے لئے مانگا تھا۔ اُس کا گھر سُونا تھا۔ سارے لوگوں کو اُس سے ہمدردی تھی اور بخشی کے باپ نے کہا تھا۔ "میں نے تجھے اپنی لڑکی دان دی ہے۔" بخشی بڑی الہڑ تھی۔ وہ گھر کو سنبھالنے کے قابل نہ تھی۔ یوں بھی پریتو جیسی سوجھ بوجھ ہر لڑکی میں کہاں ہوتی ہے۔ بخشی کی عادتوں میں ابھی بچپنا تھا اور اسی لئے جب اُس کے پاس ہی میں نے جوالا سنگھ کو باندھا ہے تو بھی وہ نہ جاگی۔

پھر میں نے اُسے جگا کر باندھ دیا۔ وہ بندھی ہوئی بھی اونگھ رہی تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سارا تماشا کیا ہو رہا ہے۔ وہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے

میلے بالوں میں گندی سی گڑیا لگ رہی تھی جو یوں ہی کسی مصیبت میں پڑ گئی ہو۔

پھر میں نے بوڑھے کرتار سنگھ کو بھی رسیوں سے جکڑا اور اسے بھی اُس کوٹھری میں لے آیا۔

بچھٹی کے ڈھیر مَیں نے پہلے سے ہی کھسکا کر کوٹھری کے دروازے کے قریب کر لئے تھے۔ پھر میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا" جوالا سنگھ! میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو میری ماسی کا پوت تھا۔ تو نے میری عزت پہ ہاتھ ڈالا ہے تجھے اس کا بدلہ دینا ہوگا۔ جوالا سنگھ کی آنکھوں میں خوف تھا، جیسے اُس کھیل کا ایسا آخر اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ ایک بچے کی طرح جس نے کھیلتے کھیلتے اپنی سب سے پیاری شئے کھو دی ہو اور اب افسوس بھی نہ کر سکتا ہو۔ پر اس کی آنکھوں میں زندگی مانگنے کی بھیک نہ تھی۔

میں نے کہا" تم دونوں نے زندگی اور موت میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ قول نبھانا ہوگا۔" پھر میں نے بخشی سے کہا۔" بخشی! تو نے میرا قصور نہیں کیا۔ میرا تیرا کوئی جھگڑا نہیں۔ تو اگر چاہے تو بچ سکتی ہے۔ تو جوالا سنگھ کے ساتھ کیوں آگ میں پڑے۔ بول بخشی! تیری اور میری بہن کی بڑی پریت تھی۔ اب وہ پریت نہیں رہی۔ وہ بھی نہیں رہی۔ پر مجھے تجھے کچھ نہیں کہنا، بول!"

جب میں نے بخشی کا مُنہ کھول دیا تو وہ کہنے لگی" ہری سنگھ گرنتھ کے سامنے میرے اور جوالا سنگھ کے پھیرے ہوئے تھے۔ اور میں نے بھی آخر تک اُس کا ساتھ دینے کا قول کیا تھا تب واہ گرو بھی وہاں تھا۔ اب بھلا میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں گی؟ اس کے پیچھے زندہ رہ کر کیا کروں گی بتا؟"

وہ چھوٹی اور الھڑ سی لڑکی کہاں تھی۔ وہ لڑکی جو تھوڑی دیر پہلے بڑی چھوٹی سی گندی میلی گڑیا لگ رہی تھی اور یہ عورت جو جوالا سنگھ کے ساتھ موت قبول کر رہی تھی یہ یقیناً بخشی نہ تھی۔"

میں نے کہا" اچھا جو تیری اور واہ گرو کی مرضی ہو۔ اور میں نے اس کا مُنہ پھر باندھ دیا۔

پھر میں نے چاچے کرتار سنگھ سے کہا" چاچا تیری میری کوئی لڑائی نہیں۔

میرا باپو تیرا بھائی ہے، تو ہماری برادری کا سب سے عقلمند آدمی ہے۔ تیری بات چوپال میں کسی نے کبھی رد نہیں کی۔ بتا میں کیا کروں؟ جوالا سنگھ نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا چاچا، پر تیری زندگی تیرے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اگر تو کہے تو میں تجھے چھوڑ دوں۔"

چلپچے نے کہا۔ "ہری سنگھ پوت یہ زندگی کی ڈگر ہے جس کو ہم میں سے کوئی بدلنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تو نے جو کچھ کیا اگر نہ کرتا تو مرد نہ ہوتا۔ تیری راہ سیدھی ہے، میں تجھے دوش نہیں دوں گا۔ پر میں بھی بہت بوڑھا ہوں اور جوالا سنگھ کے بعد تجھ سے اُس کی موت کا بدلہ لینے کے قابل نہیں۔ میری ہڈیوں میں اب نہ وہ جوش ہے اور نہ طاقت۔ جوالا سنگھ کے بعد میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ ہری سنگھ اچھا ہے تو جو کچھ اُس کے ساتھ کرنا چاہتا ہے کرے پر ہم اس کا ساتھ دیں گے۔ میں بھی اور بخشی بھی۔ پھر اس نے پہلی بار اپنی بار اپنی ننگے سر بیٹھی بے بس بہو کو دیکھا اور مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

میں نے بخشی کے ڈھیر ہوئے ہوئے اُن کے گرد چُن دیے۔ مٹی کا تیل ڈال کر آگ لگا دی اور کوٹھری کا دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

اناج کی کوٹھری میں سے پربتو کے ٹکڑوں سے بھری بوری اُٹھا کر میں جب تیزی سے گلیوں میں گزرتا نہر کے پُل کی طرف جا رہا تھا تو گاؤں میں واویلا مچا ہوا تھا۔ لوگ جوالا سنگھ کے گھر کے گرد اکٹھا ہو رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ تینوں کب کے جل چکے تھے۔ تینوں جنھوں نے الگ الگ مرنے اور بہت دنوں ایک دوسرے کا انتظار کرنے کی بجائے ایک ساتھ مرنا قبول کیا تھا۔

نہر پانی سے بھری ہوئی اور بادلوں کے سیاہ ٹکڑوں کے پھٹے کناروں سے جھانکتی روشنی میں سیاہی اور سفیدی سے بنا دور تک پھیلا کپڑا لگ رہی تھی۔ پُل کے نیچے اندھیرا تھا اور پانی گھر گھر کر کے ستونوں کے ساتھ ٹکرا رہا تھا۔ اُچھل رہا تھا اور بھنوروں میں گھوم رہا تھا۔ اندھیکار جس کا رشتہ پتہ نہیں کس پاتال اور کس ساگر کے ساتھ تھا۔ میں نے بوری کو سر سے اوپر اُٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا جیسے میں آپ بھی اپنے سر سے اونچا اُٹھ گیا ہوں اور اب بوری کے ساتھ نہر میں گر جاؤں گا۔ مگر میرے قدم دھرتی پر تھے اور ابھی کتنے گناہوں کا بوجھ میں نے اُٹھانا تھا۔

پرتیو کے سپنے اور اس کی آشائیں سارے اندھیرے میں اپنی راہ ڈھونڈنے میں کسی کسی نئی پاتال میں اُتر گئے۔ اُس گھڑی مجھے یاد آیا کہ میلے پر جانے سے چند دنوں پہلے سے میں نے اُسے آپ ہی آپ ہنستے دیکھا تھا۔ چوکے میں بیٹھی ہے، روٹی پکا رہی ہے اور مَن ہی مَن مُسکرا رہی ہے۔ ہونٹ آدھے کھلے ہیں اور آنکھیں پتہ نہیں کیا دیکھ رہی ہیں۔ جیسے وہ اس دنیا میں نہ ہو۔ میں اور باپو چارپائی پر بیٹھے ہیں اور پانی پکڑانے میں بے دھیان سے وہ گلاس میری جگہ باپو کو روٹی میرے تھال میں رکھ رہی ہے۔ ماسی بھی اُن دنوں ہولے ہولے بڑبڑاتی رہتی مگر پرتیو کسی بات کا بُرا نہ مناتی۔ اُس کی چُنری میں اُن دنوں رنگ بھی گہرا ہوتا تھا۔ اور میں نے سوچا تھا۔ جوان ہوتی لڑکیاں رنگوں اور سپنوں اور پھول سے آنے والے دنوں کا سواگت کرتی ہیں۔" پُل پر کھڑے ہو کر میں نے کہا تھا" ماں ہوتی تو اس طرح پرتیو کا اور میرا رشتہ ٹوٹ نہ جاتا۔ پرتیو کے بعد اُس آنگن میں کبھی ہنسی کی چھنکار سنائی نہ دی۔ کبھی چوڑیوں کی جھنکار نہیں گونجی، کبھی سپنوں بھری آنکھیں دیواروں پر نہیں پڑیں۔ چانن سنگھ اُن دنوں مجھے پتہ چلا تھا کہ سپنے دیکھنا عورتوں کے حصے میں آئے ہیں۔ عورت آپ بھی ایک سپنا ہے۔ پھول کے اندر خوشبو میں بند۔ رنگ کے اندر اُس کی اُڑان میں بند۔ عورت ماں ہو، بہن ہو، بس سپنے دیکھتی ہے اور اُن کو سچ سمجھنے میں اپنی ساری زندگی بتا دیتی ہے۔ پرتیو کا سپنا چھوٹا سا تھا۔ برسات میں اُڑنے والی چیونٹیوں کی طرح اُس سپنے کے پر نکل آئے۔ وہ روشنی کی تلاش میں گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا اور اُس کے ساتھ وہ دیا بھی بُجھ گیا۔

اسی رات میں میلے میں پہنچ گیا۔ میں نے سارے سودے کسارے کیے۔ پیارا سنگھ نے میری شکل دیکھ کر کہا۔" سردار تیری صورت اتنی پھیکی اور رنگ اتنا اُڑا اُڑا کیوں ہے، کیا تیرا جی اچھا نہیں؟" باپو مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اور میں نے اُسے کھوجنے کی بھی کوشش نہ کی۔ میری آنکھوں کے سامنے دھند سی آ جاتی۔ میلے میں پھیلے دور دور تک لگے ہاٹ مجھے زہر لگتے۔ چوڑیوں دکانوں پر اپنی باہیں بھرواتی سوانیاں مجھے بہت بُری معلوم دیتیں۔ ساری عورتیں ہی ایسی ایسی ہو سکتی ہیں۔ اپنے سپنوں کو لے کر دیوں کی کھوج میں گھومتی ہوئیں۔ مجھے کسی پر

اعتبار نہ رہا۔ دنیا کی ساری روشنی سکڑ کر میرے لئے ایک نکتہ بن گئی۔ خوشیاں دکھوں میں رل گئیں۔ پرہیتو کے بعد سے مجھے کسی شے کی کھوج نہیں رہی چانن سنگھ۔ مجھے آج تک کسی شے کی کھوج نہیں ہے پر ایک بات کا پتہ نہیں چلتا چانن سنگھ، انسان اتنا خود غرض کیوں ہے۔ وہ سارے پیار اپنے لئے ہی کیوں سمیٹنا چاہتا ہے؟ میں نے کہا شاید یہی بات تھی۔ میری اور چیت سنگھ کی خود غرضی ہی تھی جو ہمارے درمیان دیوار بن کر کھڑی ہو گئی۔

ہری سنگھ نے کہا۔ "نہیں بھتیجے، مرد عورت کے سارے سپنوں کا دیا آپ بننا چاہتا ہے۔ سالوں کے بعد یہ بات مجھے جب سمجھ آئی ہے تو پرہیتو نہیں ہے۔ اُس غصے میں جو پیار کو پیچھے چھوڑ گیا۔ یہ بھی قصور تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا، پرہیتو میرے علاوہ کسی اور میں اتنا وشواس کرے۔"

"شاید یہ بات ہو۔" میں نے کچھ سمجھتے ہوئے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

کونجوں کی ڈار چاند کے سامنے سے اُڑکر آکاش اور دھرتی کے ملتے کناروں کی طرف چلی گئی۔ کھوہ پر لوٹی اینٹوں میں سے پھدک پھدک کر مینڈک باہر نکل آئے۔ اور پیپل کی شاخوں پر پرندے کبھی کبھی نیند میں چونک چونک کر بولنے لگتے۔ میں سوچ رہا تھا بیکانیر پتہ نہیں کتنی دور ہے؟

ہری سنگھ نے کہا۔ "میلے میں ہاٹ ہاٹ گھومتے جب ہمیں یہ خبر ملی کہ رات کسی نے میری بہن پرہیتو کو مار دیا ہے۔ جوالا سنگھ کا گھر جل گیا ہے اور وہ سارے اندر جل کر مر گئے ہیں تو میں پرہیتو کے لئے چوڑیاں لئے بنا پینگوں والی چنری اور ماسی کے لئے کرتے کا کپڑا خریدے بغیر واپس آ گیا۔ آس پاس جس کسی پر شک کیا جاتا تھا، شہر میں سختیاں سہتا اور پولیس کے چکر میں پڑا رہا۔ تین سال بعد مقدمہ خارج ہو گیا۔

کسی عورت کو چوڑیاں پہنے دیکھ لوں تو مجھے پرہیتو یاد آ جاتی ہے۔ پینگوں والی چنری میں مجھے پرہیتو کا دل اٹکا لگتا ہے۔ میں نے تب سے آج تک کبھی مٹھائی نہیں چکھی چانن سنگھ۔ زندگی کی ساری خوشیاں میرے لئے اُس دن ختم ہو گئی تھیں جب پرہیتو سر جھکائے میرے سامنے بیٹھی تھی اور جی میں سوچ رہی تھی کہ سارا قصور

اُس کا ہے جوالا سنگھ کا نہیں۔ عورت اپنے سپنوں کی خاطر یوں چپ چاپ بھینٹ چڑھ جاتی ہے۔ ہم عورت کے سپنوں میں کہیں نہ کہیں روک بن جاتے ہیں۔ ہم اُسے سپنے بھی نہیں لینے دیتے۔ ہم سب کے سب، تم اور میں اور باقی دنیا اُس کے سپنوں کے ہی خلاف ہیں۔

پریتو کے مرنے کے بعد سونے گھر کو بسانے کے لئے باپو نے میری منت کی۔ دل ہی دل میں اپنے پر اور باپو پر اور باقی گاؤں پر ہنسا۔ میں نے باپو کی بات مان لی۔ آخر کہاں تک کوئی بنا بات کے انکار کرتا جائے۔ جن دنوں برادری کی عورتیں ہمارے گھر میں ڈھولک لے کر بیٹھتیں تو میں باہر نکل جاتا۔ اُن راتوں میں میں نے پریتو اور جوالا سنگھ دونوں کو دیکھا ہے۔ درختوں کے تنوں کے پاس کھڑے چاند کی کرنیں اُن کے آرپار ہوئی جاتیں۔ ہنستے ہوئے تصویر کی طرح ہوا کے ساتھ اُڑتے وہ میرے پاس آتے اور پھر دور چلے جاتے، میں آنکھیں مَل کر دیکھتا تو وہاں کچھ نہ ہوتا۔ پر میری بہن نے کبھی میری طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ وہ مجھ سے روٹھی ہوئی تھی۔ آخری رات کے بعد جب وہ میرے سامنے سر جھکائے بیٹھی تھی اُس نے کبھی میری طرف نہیں دیکھا۔ عورت رنگ روپ اور سپنا ہے چاننن سنگھ، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

وقت وقت کے دُکھوں کی دوا ہے پر وہ میرے لئے کچھ نہ کر سکا۔ پتہ نہیں کون شکتی ہے جو آج تمھارے سامنے مجھے اپنے آپ کو اس طرح ننگا کرنے پر مجبور کر رہی ہے ورنہ ہم ساری عمر لپیٹے لپٹائے اپنی مورتی کو اپنے کندھے پر اُٹھائے گھومتے ہیں اور آج جب میں تمہیں اتنا کچھ بتا رہا ہوں یہ کیوں نہ بتادوں کہ سُرجیت کو بھی میں نے مار دیا تھا۔

سُرجیت جیسے سُر ہو گیت کا بہتا دھارا ہو۔ جیسے کسی راگنی کا روپ ہو۔ اتنی کومَل کہ ہوا پر تصویر کی طرح لگتی۔ چاندنی میں اُس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ وہ روشنی کے ساتھ اوپر اُٹھتی لگتی۔ کرنوں کی نرمی سے دل کے اندر اتر جانے والی میری سختی کے سامنے اُس کے روپ نے ہار مان لی، پر میں غلط کہہ رہا ہوں۔ وہ مجھ سے جیتنا کب چاہتی تھی۔

میرے لئے ساری عورتیں پرتیو ہیں۔ اگر وہ اُلٹا سپنا لے سکتی تھی تو ہر عورت غلط ہے۔ اس کے بعد دنیا میں کیا باقی رہا ہے اور اگر ہے تو میں اس پر وشواش کیسے کر سکتا ہوں؟

دُکھی دل کے ساتھ میں نے سوچا۔ میں سرجو کو ساری عمر گھر نہیں لاؤں گا۔ مگر اس کا باپ سفید پوش تھا۔ دس گاؤں میں اُس کی عزت تھی۔ ان کے ڈر سے میرے انکار کے باوجود باپو نے بیاہ کے چار ماہ بعد مجھے اُسے لوانے کے لئے اس کے میکے گھر زبردستی بھیج دیا۔

"بہار کی سُہانی رُت تھی۔ سرد ہوا میں آموں کے بُور کی خوشبو تھی۔" ہری سنگھ چاچا ایک دم چُپ ہو گیا۔ دور کہیں کوئل کو ہُو کو ہُو بول رہی تھی۔ چاند نیچے جھکتا جاتا تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا۔ بیکانیر کی سرحد پار کرنا اب کبھی نہ ہو سکے گا۔ چیت سنگھ بے آواز قدموں سے سدا میرا پیچھا کرے گا۔ میں کہاں جا سکوں گا۔

ہری سنگھ چاچا یکایک کھڑا ہو گیا اور بولا۔ "چا تن یہ قصے میری ساری زندگی پر پھیلے ہیں۔ آؤ چلیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں چاچا بہار کی رُت کی بات سُن کر بھی بڑا وقت باقی ہے۔ تم کہو پھر سُرجیت کا کیا بنا؟"

"سُرجیت کو میکے گھر سے لوانے جاتے ہوئے میں جوان تھا۔ میری نئی جوتی دھوپ میں چمکتی اور چک میرے ہاتھوں میں مہندی کی باس میں رل کر میرے گرد پھیل رہی تھی۔ میں اپنی اصیل گھوڑی پر اکڑ کر بیٹھا تھا پر میری آنکھوں میں سرجو سے ملنے کی خوشی کا نشہ نہ تھا۔ مجھے پرتیو یاد آ رہی تھی جس نے کہا تھا۔ "جوالا سنگھ کا کوئی قصور نہیں۔" وہ کیوں جوالا سنگھ کو بچا کر سارے الزام اپنے سر لینا چاہتی تھی۔ کیا محبت موت سے بھی زبردست ہے؟ اور اس دن پہلی بار میرا جی چاہا، میں بھی کسی کو چاہوں۔ کسی کے لئے اپنے گلے پر چھُری رکھوا لوں اور اُف نہ کروں۔

مگر سُرجو کو میکے سے لینے جاتے میں نے سوچا تھا۔ میں اسے کب اُٹھا سکوں گا۔ اُسے دینے کے لئے میرے پاس کیا ہے۔ اس سے لینے کی بھی میرے دل میں کوئی خواہش نہ تھی۔ میرے دل میں کسی چاہت کا خیال نہ تھا۔

میں نے دھوکا باز کی طرح جھوٹی مسکراہٹ کا پردہ سا اپنے اوپر کر لیا۔ سسرال گھر میں نواڑی پلنگ پر بیٹھا جھکی جھکی آنکھوں سے سب طرف دیکھتا۔ میں ساس اور سرجو کے باپ اور بھائیوں کی میری دلداری کرنے کی کوششوں کو دل ہی دل میں ہنس کر دیکھ رہا تھا۔ وہ سارے میرے آگے پیچھے پھر رہے تھے۔ گاؤں کی عورتیں اور لڑکیاں دم دم چوکھٹ میں کھڑی ہو کر اندر جھانکتیں۔ کہاریاں منہ پہ پلّو کئے مجھے پنکھا جھلتیں۔ میں اُس گھر کی زندگی تھا۔

سسرال گھر سے ہم چلے ہیں تو سامان کا بھرا گڈا زوں زوں کرتا سرجو کی ڈولی کے ساتھ تھا۔ اور میں سوچ رہا تھا اگر پریتو زندہ ہوتی تو سویرے کے ساتھ وہ بھی وداع ہو کر کسی گاؤں جاتی۔ کوئی بانکا چھیلا ہمارے بھی آنگن میں آتا۔ ہم سب گیتوں سے اُس کی تواضع کرتے۔ اُس پر سے روپے وارتے۔ اُسے لال پایوں والے نواڑی پلنگ پر بٹھاتے۔ اُس کے آگے پیچھے پھرتے۔

سایوں میں یوں ہی جگہ بہ جگہ ٹھہرتے میں کہاروں کو تھکا دیا۔ شام ہمیں گاؤں سے دو چار کوس ادھر ہی ہل گئی۔ نہروں میں پانی ہولے ہولے بہنے لگا۔ ہوا تھک کر آہستہ چلنے لگی۔ بادلوں کی سرخی پانی گھل گئی۔ چارے کے گٹھے اٹھائے عورتیں اور بیلوں کو ہنکاتے چھوٹے لڑکے اندھیرے کے نکتوں کی طرح بن گئے۔ کھیتوں میں ڈوبے درختوں پر چڑیاں، کوّے بیٹھنے لگے۔ دور تک پھیلے کھیتوں کی ہریالی میرا جی اُداس کر گئی۔ نئی دھرتی کی باس ہل سے نکلتی ہوئی چاروں طرف سے مجھے جکڑنے لگی۔

میں نے کہاروں سے کہا۔ تم ڈولی لے کر آگے چلے جاؤ۔ میں اور سرجو نہر کے کنارے چلتے ہیں۔ وہ سارا دن بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوگی۔

میں نے جب ڈولی کا لال پردہ اٹھایا تو سرجو کی آنکھیں جھک گئیں۔ وہ رنگین شلوار کو سنبھالتی اور مہندی سے پیروں کو آگے کر کے اُترنے لگی۔ اُس کے گلے میں پڑے زیور اور رانی ہار کے رنگوں پر روشنی دھنک کے سارے رنگ بن رہی تھی۔ نتھ میں لگے سرخ موتیوں کا عکس اُس کے ہونٹوں کو اور بھی سرخ کر رہا تھا۔ اپنی پلکیں جھکائے، گوٹے سے بھرا دوپٹہ ماتھے تک کھسکاتی وہ

باہر آگئی۔ جب کہار ڈولی لے کر دور چلے گئے اور وہ اپنی قمیص کو ہاتھ پھیر کر گھٹنوں پر سیدھا کر چکی تو سرخ رومال سے اپنا مُنہ ڈھانپتی ہوئی وہ میرے پاس کھڑی ہو گئی۔

اُس کے گرد شام کی ساری خوشبوئیں تھیں اور دن بھر کے مسلے ہوئے کپڑوں میں انوکھی باس تھی۔ دھرتی کی باس، جیسی ہل چلا کر میں نے کبھی کبھی نئی زمین میں محسوس کی تھی۔ سونگھی تھی۔ پوترتا۔ نرمی اور اپنے اندر چھپے خوابوں سے مل کر بنی ہوئی وہ باس بھی میرے ارادے کو بدل نہ سکی۔

میں نے کہا سرجو کچھ بولو، کچھ کہو۔

وہ شرم سے دوہری ہو گئی اور میری طرف پیٹھ پھیر کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کے بالوں میں گُندھے سونے کے پھول کانوں کے دونوں طرف ذرا ذرا اونچے تھے۔ اور دوپٹے میں سے چمک رہے تھے۔ اُس کے پراندے میں پڑے سرخ پھُندنے جس میں سونے کے تاگے تھے نیچے اور نیچے لٹکتے بڑے بھلے لگ رہے تھے۔ اور وہ آپ جیسے کوئی سُندر سپنا ہو۔ میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ دھرا تو وہ کانپ گئی۔ اُس کی کپکپاہٹ میری انگلیوں کی پوروں میں سے ہوتی ہوئی میری جان کو ٹھنڈا کر گئی۔ جیسے میری موت نزدیک ہو۔ بیٹھے ہوئے دل کے ساتھ جب میں نے اُسے کہا، سرجو میری طرف دیکھو تو اس نے ہولے ہولے گھوم کر بہت آہستہ اپنی آنکھیں اُٹھائیں۔ مگر وہ نگاہ نہ تھی۔ وہ پھول کی نازک پنکھڑی کی خوشبو تھی۔ جو میرے کٹھور دل کو چھو کر واپس چلی گئی۔ میرے اندر پتھر کا دل بھلا کہیں پگھل سکتا تھا۔

میں نے کہا۔" سرجو آؤ اس نہر کے کنارے لیٹ جاؤ۔ تم تھک گئی ہو، ذرا دم لے لو۔ اُس نے نہ تو میری طرف حیرت سے دیکھا اور نہ ہی خوف سے۔ وہ ہری گھاس پر گٹھری سی بن کر پڑ رہی۔ میں نے سوچا بس یہ رنگ ہے اور روپ ہے۔ میں اس کو اکٹھا کر لوں گا اور سرجو کو نہر میں بہا دوں گا۔ ہر عورت میرے لئے پرتیو کی طرح تھی۔ پتہ نہیں اس رنگ اور روپ سے پرے کون سے سپنے ہیں جو ان آنکھوں میں کروٹیں لے چکے ہیں۔ اس نرمی اور چاند کی سی ٹھنڈک کو کون ہاتھ چھو چکے ہیں۔

پھر میں نے کہا۔ دکھاؤ سرجو تمہارے ہاتھوں میں چوڑیاں ہیں؟

سرجو نے سُرخ چوڑی سے بھری باہیں میرے سامنے کر دیں جیسے ایک

جھونکے سے کوئی نئی شاخ ایک لمحے کے لئے جھول جائے۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لئے۔ اس کی انگلیوں میں سارے جسم کی نرمی آگئی تھی۔ میں نے پور پور کر کے اُنھیں چوما جیسے کوئی فرض ادا کر رہا ہوں اور کوئی سچ کہہ رہا ہوں، جیسے آگ کے سامنے کھڑا ہوں اور صرف ٹھیک بات کہنے پر مجبور ہوں۔ وہ اپنا مُنہ چھپائے لیٹی رہی۔ اس کا جسم رہ رہ کر کانپ اُٹھتا۔

میں نے جب اُسے بال کھولنے کو کہا تو تب بھی اُسے حیرت نہ ہوئی۔ اُس نے ہولے ہولے مینڈھیاں کھولیں۔ گندھے ہوئے زیور کھولے اور اُنھیں قریب رکھ دیا۔ جب وہ بال کھولے بیٹھی تھی تو مجھے لگا وہ اُڑ جائے گی۔ شام کی سرخی میں چھپ جائے گی۔ اور میں ہاتھ ملتا رہ جاؤں گا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور تیز دھار والی کرپان سے اُسے کاٹنے لگا۔ میں نے اس کے ٹکڑے نہر میں بہا دئے۔ پانی میں بادلوں کی سرخی کے ساتھ سرجیت کی مہندی کی سُرخی تھی۔ اُس کا سُہاگ پانی کے قطروں میں مِل گیا۔ اُس کے جسم کی نرمی ہوا میں رچ گئی۔

میں نے اُٹھ کر گھوڑیاں کھولیں۔ ہری سنگھ چاچا اور میں دونوں چُپ چاپ بیکانیر کی طرف جانے والی راہ پہ جا رہے تھے۔ اور میں اپنے سیدھے ہاتھ کو دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ دو سال کے بعد اب اس ہاتھ سے روٹی کھا سکوں گا۔





واجدہ تبسم

رانی دُلہن پورے دنوں سے تھی۔

بی ساس کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا تھا۔ بڑے گھر میں یہ کوئی پہلا زچگی جاپہ تو تھا نہیں جو یوں سیسا بی پھول کی طرح کھلی پڑتیں۔ مگر یہ بھی تو قسمت کی خوبی ہی تھی ناکہ اوپر تلے کے چار بیٹوں میں سے کسی نے تو اماں بیگم کو پوتے کی دادی نہ بنایا۔ لے دے کے انگنائی، صحنائی اور گھر بھرے میں لڑکیاں ہی لڑکیاں پھرا کرتیں۔ اماں تو رہ رہ کر سوچتیں: ہے ہے، جس بہو کو دیکھو ٹپاٹپ بیروں کی طرح بیٹیاں جنے جا رہی ہیں۔ آخر ان کا کیا ہوگا؟ اور خاندان کا نام کیسے چلے گا؟" مگر وہ صرف سوچ تو سکتی تھیں، لیکن لڑکیوں کو پیدا ہونے سے روک کہاں سکتی تھیں۔

دھنیا دائی محلہ چھوڑ پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ جہاں کسی نئی نویلی پر اس کی نظر پڑی اُس نے جھٹ وہیں بتا دیا:

"میں کہوں بہو پوت جنے گی"

اگر کسی کو بیٹی ہونے کی بات سنا دی، تو کیا مجال جو بیٹا سر اٹھا کر چلے۔ وہ تو چال دیکھ کر بات پہچانتی تھی۔ خود اس کی اپنی بہو نے ایک کے بعد ایک، چھ بیٹے پیدا کر ڈالے تھے۔

میاں کو بٹیا رانی کا وہ ارمان تھا کہ نچلے ولے بیٹے کو سدا رنگین کپڑے پہنا کر زیور سے لادے رکھا۔ ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، اور تو اور چھن چھن کرتی جھانجھیں بھی پیروں میں ڈال دیں۔ بڑی بوڑھیاں ٹوکتی بھی تھیں کہ اس کی تو عقل اُلٹ گئی ہے۔ بچپنے ہی سے اُسے بیٹی کا سوانگ دے رکھا ہے، بھلا اس پر کیا اثر پڑے گا؟ ساری عمر ماں کے کولے سے لگا ہانڈیاں دھوتا اور روٹیاں بیلتا رہے گا۔ بھوان کے طعنے خوب سمجھتی تھی، مگر ممتا کے مارے جی کو ننھی منی سی کلی کی لگن تھی تو پوری بھی کیسے پڑتی؟ مگر اگلے برس جب بہو کو حمل ٹھہرا اور وہ سہم سہم کر قدم اُٹھانے لگی اور اہلی گملی پھر پھر کر کچّے پکے پر للچانے لگی تو ساس نے ایک دن اس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کہہ دیا:۔

"میں کہوں اب ننھے کے انگ پر سے ریشم اور زیور اُتار لے۔"

بہو نے چکرا کر ساس کو دیکھا تو ساس ہنسی اور بولی:۔ "اور کیا۔ یہ دیکھ، رات کو نیند میں، مَیں نے تیرے گلے سے گلسر اتاری اور تو کسمسائی تک نہیں۔ نیند ایسی ٹوٹ کر آئے تو بیٹی کو ساتھ لاتی ہے۔ اور پھر تیرا پیٹ تو دیکھ، ابھی سے پھیلا پھیلا سا ہے۔ بیٹا پیٹ میں رہے، تو پیٹ اونچا رہتا ہے۔ ماں باپ کی ناک اونچا کرنے والا دنیا میں آنے والا ہوتا ہے نا، اس لئے۔"

"اچھا؟" بہو ذرا خفگی اور ذرا شرارت سے بولی، "تو اس کا مطلب تو یہ ہوا نا کہ بیٹی ماں باپ کی ناک کٹاتی آتی ہے۔ نکٹی ناک والی آتی ہے تو پیٹ بھی چپٹا چپٹا ہوتا ہے۔ یہی مطلب ہے نا تیرا؟"

ساس تو اپنے چھ پوتوں کی دادی کہلائے جانے پہ نازاں رہتی تھی، ہنس کر، بُرا منائے بغیر بولی:۔

"اور بتا تو سہی، کون بیٹی نے ماں باپ کا مان رکھا ہے؟ آئی بھی ہے تو مہمان کے سمان۔ جاتے جاتے آنکھ میں آنسو اور دل میں درد ہی تو دے کر گئی ہے نا۔ بول جھوٹ کہتی ہوں؟"

بہو کچھ نہ بول پائی۔ مگر جب جاپے کے دل قریب آئے تو اس کو ساس کی رہ رہ کہہ بات یاد آتی رہی اور جب کچے پکے دردوں سے گزر کر اس نے سکون کا سانس لیا تو دادی ہنس ہنس

کر محلے والیوں سے کہہ رہی تھی :۔

" اے میں کھوپڑی والی کو بلا ؤ ری، گھر میں سہاگن براجی ہے "

مگر رانی دلہن کے حق میں تو دھنیا دائی کی پیش گوئی بھی اُلٹی ہی پڑی۔ پیٹ دیکھو تو آسمان سے باتیں کرتا تھا اور جنم دیا بیٹی کو۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار یہی ہوا۔ گھر میں لڑکیوں کی فوج تیار ہو رہی تھی۔ جٹھانیاں، دیورانیاں سبھی لڑکیوں والی تھیں۔ اس خاندان میں ہی بیٹوں کا کال تھا۔ ہاتھ کی بات تھی ہی نہیں۔ یاسین دو دو پڑھ پڑھ کر بیٹوں کی پیدائش کی دُعائیں مانگیں بھی، مگر اُجڑے گھر میں کبھی تو دیا نہ جلا۔

اب کے پھر رانی دلہن پورے دنوں سے تھی اور ساس کا دل پھر اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ دھنیا دائی کی بات پر یقین تھا نہ پیٹ کے ابھار نے اُنھیں امید بندھائی تھی۔ بس ان کا دل رہ رہ کر آپ ہی آپ کہتا تھا کہ کچھ بھی ہو اب کہ پوتا ہو گا ہی۔ مگر رانی کے دل پر تو ایسے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے کہ سورج کی کرن بھی انھیں چیرتی تو اجالا نہ ہو پاتا۔ اور اسے اطمینان یوں بھی تھا کہ کچھ وہی ایک تو بیٹیوں والی ماں نہ تھی، یہاں تو سارے سکے ایک ہی ٹکسال سے ڈھل ڈھل کر چلے آرہے تھے۔ نہ ساس نے کبھی رانی سے اپنی امید اور دل کی بات بتائی، نہ رانی ہی نے سوچا۔ ہاں مگر یہ ضرور ہوا کہ جب ایک رات سوتے سوتے رانی جاگی تو گھبرا گھبرا کر یہی کہنے لگی:۔

" ہائے اماں یہ کیسا درد ہے؟ پیٹھ سے اُٹھ اُٹھ کر لہریں سارے جسم کو پکڑے لے رہی ہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا "

" ایسا پہلے کبھی تو نہ ہوا " اماں کے سارے جسم نے کان بن کر بس اتنی ہی بات سُنی اور وہ بستر پر کل کے کھلونے کی طرح، پھرتی سے اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔

کمرے میں اجوائن، عود اور دھویں کے غبار میں ملی جلی گرم گرم خون کی بو تھی اور رانی کی ڈوبتی اُبھرتی سانسوں کی لہریں۔ دائی نے اندھیرے سے اُٹھا کر ہاتھوں کو اونچا کیا اور جیسے آپ ہی آپ اس کی چیخ حلق سے یوں پھوٹی کہ رانی کا سارا جسم کانپ گیا۔

" اے دُلہن میں کہوں بیٹا ہے۔ پورا کا پورا جیتا جاگتا بیٹا "

اور پھر " ہیاں، یا ہاں، ہاؤں ہاں، کی خوشگوار آواز۔ سچ مچ بیٹے کی آواز " میں آگیا ہوں اُجالے لے کر۔ ناک اونچی کرنے والا، خاندان کا نام چلانے والا "

دائی پھرتائی سے باہر نکلی اور چیختی ہوئی اماں کے پاس پہنچی :-

"اری بی بی، سنا تم نے؟ بیٹا ہے بیٹا! چاندی کے کنگن پہنوں گی، ـــ ہاں"

"اری دھیرے بول نامراد۔ ساری عمر بچے جناتے گزری، اتنا نہیں معلوم زچہ زیادہ خوش ہو جائے تو دم چھوٹنے لگتا ہے۔ وہاں تو آگے ہی ندیاں بہہ گئیں ہیں۔ اتنی خوشی کی خبر سنے گی تو جی کیا ہوئے گا۔ کتنے برسوں بعد تو آج اندھیرے میں چاند چمکا ہے"

اماں دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ رانی شطرنجی پر کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے، ایک ہاتھ زمیں پر۔ دوسرا کولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اب کہ سے پھر لڑکی ہوئی ہے۔ شرمندگی اور غم کے مارے اس نے منہ پھیر رکھا ہے۔ اب اسے میں پہلے تو یہ کہوں گی کہ لڑکی ہوئی ہے۔ اور جب وہ رونے پر آئے گی تو بتاؤں گی کہ وہ تو آج خاندان کی سب سے قابل عزت اور قابل احترام شخصیت بن چکی ہے۔ سنا رانی تم نے؟ سنا!"

ساس نے، جو پہلے ایک ماں تھیں، اور اب ایک پوتے کی دادی، دھیرے سے بہو کا شانہ ہلا کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر رانی نے ساس کی طرف نہیں دیکھا، بیٹے کی طرف نہیں دیکھا۔ کسی کی طرف نہ دیکھا۔ اتنی ڈھیر ساری خوشی ملنے کے بعد وہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی، سوائے اس کے کہ خود ہی خدا کے حضور شکریہ پیش کرنے چل دے!

رات کی سیاہی صبح سے بدلی، صبح کی روشنی پھر تاریکی میں روپوش ہوئی، مگر اماں اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ آنکھیں پھٹی ہوئیں اور سانس رکی ہوئی۔ وہ ساروں کی باتیں سن رہی تھیں، سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوں کہ کسی بات کی خبر نہ تھی۔ ایک ایک نے آ آکر ہلایا، پکارا، پچھتاوے دلائے، مگر نہ ان کی آنکھ سے آنسو نکلا، نہ ٹکٹکی ٹوٹی۔ جس جگہ رانی نے صبح کا بھرپور اجالا بکھیر دیا تھا اور اب وہاں تاریکی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچیاں ڈھائیں ڈھائیں پھر رہی تھیں اور بچہ پالنے میں پڑا روئے جا رہا تھا۔

"ہائیں۔ ھیاں۔ ھیاں۔ می ھیاں۔ میں یہاں ہوں۔ میں یہاں ہوں۔ تم کہاں چلی گئیں؟ تم نے میرے لئے دعائیں مانگیں، منتیں مانیں اور دعاؤں کا سہارا لیا، اور اب جب میں تم تک چل کر آیا تو تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اب میں کس کے پاس رہوں گا؟ کون مجھے پیٹھا رس

بلائے گا؟ اب میں کس کے پاس رہوں گا؟ سب مجھ سے دور دور بھاگ رہے ہیں۔ کسی نے میرے منہ میں کل سے دودھ کا قطرہ بھی نہیں ٹپکایا ہے امی۔ میں روتا ہوا آیا تھا کہ ہنسیوں اور مسکراہٹوں کی گود میں پلوں گا۔ مگر میرے آگے پیچھے، یہاں وہاں، ادھر ادھر، اُس پاس آنسو ہی آنسو ہیں، چیخیں ہیں، آہیں ہیں۔ بے نور آنکھیں ہیں اور تاریکیاں ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں، میں منحوس ہوں۔ میں نے اپنی ماں کو کھا لیا ہے۔ تائیاں، چچیاں مجھ سے دور دور بھاگ رہی ہیں۔ ایک دو دن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا ساتھ ہے، کون دے گا؟ کون مجھے پیار سے گلے لگائے گا امی! دادی اماں مجھ سے بات نہیں کرتیں۔ ابو مجھے صرف دیکھ سکتے ہیں، سنبھال نہیں سکتے۔ پھر میں کہاں جاؤں؟ کہاں جاؤں؟ ھیاں۔ ھیاں۔ می ھیاؤں"

رانی مسکرائی۔ دو ہاتھ، سوکھے مارے مگر محبت کی آگ سے تپتے ہوئے ہاتھ، جن میں خون کی رمق بھی نہ تھی۔ جن میں چوڑیوں کی چھنک نہ تھی، پالنے کی طرف بڑھے اور انھوں نے ایک ننھے منے گیلے گیلے وجود کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی منجھلی پھوپھی" رانی جیسے سرگوشی میں بولی۔

پھوپھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کیسی آواز تھی؟ یہ کیسی سرگوشی تھی؟ یہ کون ان سے اس قدر قریب ہو کر گزرا تھا؟ انھوں نے کانپ کر بچے کو گلے سے لگا لیا۔

"میرے بچے! میرے بچّے! میری جان!" ان کی آواز کانپ رہی تھی۔ اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

منجھلی پھوپھی اماں کی سب سے چھوٹی نند تھیں۔ جب اماں بیاہ کر آئی تھیں، تب تو وہ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں۔ عمر میں وہ اپنے بڑے بھتیجے سے بھی دو چار برس چھوٹی ہی تھیں۔ بھتیجوں کے بیچ وہ گڑیا سی بہن نظر آیا کرتیں۔ سمجھنے والے انھیں بھی اماں کی بیٹی ہی سمجھتے۔ اماں تو پتہ نہیں کون سا خون، کون سا اثر لائی تھیں کہ چھ سات بیٹیوں کے ساتھ ساتھ چار بیٹوں کی بھی ماں بن بیٹھیں، ورنہ یہاں تو نسل در نسل یہی ہو رہا تھا۔ کہ ایک آدھ لڑکا ہو گیا جس سے خاندان چلتا رہا۔ جب اماں کی ساس مریں اُس وقت تک سب اولادیں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ بس ایک منجھلی نند ہی باقی رہی تھیں۔ ساس نے اسے جیسے بہو کی گود میں ڈال دیا تھا۔ کچھ یہ نہ سمجھا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ وہ بھی سدا بھائی بھاوج

ہی میں گھلی ملی رہیں۔ دن بیتے اور اماں نے بیٹے بیٹیوں کے گھر بسانے شروع کئے تو منجھلی کو بھی ماں بن کر بیاہا۔ مگر رفو کو بھاوج کا ساتھ کچھ ایسا بھایا تھا کہ دور رہ ہی نہ سکی۔ جاڑوں کی ایک رات اس کے میاں نہا کر پنکھے کی ہوا میں سوئے اور صبح اُٹھے تو سارا جوڑ جوڑ جکڑا ہوا تھا۔ تین چار دنوں میں رفو کیا سے کیا ہو گئی۔ بھاوج نے لال کپڑوں سے وداع کیا تھا اور بھائی جب لائے ہیں تو سر سے پاؤں تک سفید، برف کی کلی بنی ہوئی تھی۔ جی کھول ہنسنا رفو کو راس نہ آیا۔ اس کے ہونٹ سل گئے، ارمان گھٹ گئے اور وہ جلی شاخ کی طرح جہاں کی تہاں رہ گئی۔ تاروں بھرا آسمان سر پر جگمگاتا۔ اور وہ دل میں اندھیرے لئے سسکتی رہی، جاڑے گرمی، برساتیں، خزاں، بہار، سب اس کے لئے ایک جیسی بات تھی۔ اور جیسے جیسے دن بیتے وہ بھتیجیوں، بھتیجوں کے بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے کو بیتی گئی۔ کوئی اسے گھرک دیتا، کوئی دو بول سُنا دیتا۔ کوئی قصور نہ ہونے پر بھی ڈانٹ دیتا اور وہ خاموش اور معصوم آنکھوں سے دیکھ کر گویا اپنے ناکردہ گناہ کا اعتراف کر لیتی۔ میاں اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر مرے تھے، سارا پیسہ اسی کے حصے میں آیا تھا۔ وہ چاہتی تو اپنا ایک گھر بار کر سکتی اور مزے میں جی سکتی تھی۔ مگر وہ انہی لوگوں میں جیتی آئی تھی، وہ ان سے ہٹ کر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ وہ تو بھری بہار میں اُجڑ کر رہ گئی تھی۔ کون اسے دیکھنے اور نہارنے والا بیٹھا تھا؟ پہنتی، اوڑھتی بھی تو کس کے لئے؟ سارا پیسہ انہی بچوں پر اُٹھا دیا کرتی۔ وہ مشین کی طرح ہر کام انجام دیا کرتی لیکن۔ لیکن اتنے دنوں بعد اب پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔

ننھا شمیم ابھی دو ہی چار دنوں کا تو تھا۔ بے چارے نے ماں کا دودھ چکھا بھی نہ تھا۔ اس کی زندگی کا کیا بنے گا؟ کیا یہ پھول کمہلا کر رہ جائے گا؟ رفو نے بے بسی سے ان ماؤں کی طرف دیکھا، جن کی چھاتیاں دودھ سے لبریز تھیں اور محض دو گھونٹ اس ننھی سی جان کی زندگی کا سامان مہیا کر سکتے تھے۔ مگر اپنے خون سے کسی دوسرے کے لگائے پودے کو سینچنے کا ظرف کتنی ماؤں میں ہوتا ہے؟

منجھلی پھوپھی نے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ ممتا کے سوتے تو مدت ہوئی وہاں خشک ہو چکے تھے۔ پھر — پھر اُنھوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا

اس کا خدا ہوتا ہے۔ اُنھوں نے روئی کی بتی بنائی اور گائے کے دودھ میں بھگو بھگو کر ننھے کے منہ میں ٹپکانے لگیں۔

زندگی کا یہ پہلا دور تھا، جب وہ خوشی خوشی جینا سیکھ رہی تھیں۔ بچپن تو جیا بنیا سوچتا، بڑی ہوئیں تو ماں کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ بیاہ کر میکے سے سسرال آئیں تو چند ہی دنوں میں ساری خوشیاں جل کر خاک ہو گئیں۔ نہ وہ کسی کے لئے جی سکیں۔ نہ کوئی ان کے لئے زندگی کا سامان کر سکا۔ اب ان کی زندگی ایک نئی، پر بہار اور رنگین راہ پر چل پڑی تھی۔ وہ جیتی تھیں ننھے کے لئے، مسکراتی تھیں ننھے کے لئے۔ اور پھر ننھا تو سبھی کی خوشیوں کا مرکز تھا۔ کئی دن گزرنے پر اماں جی ہوش میں آئیں تو دیکھا کہ شمو نند کی گود میں رہ رہ کر ہمکتا تھا اور کوئی اُسے لینے کو ہاتھ بڑھاتا تو وہ منہ پھیر کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیتا۔ تینوں پوتیاں تو اماں ہی کی نظر شفقت کی مرہون منت تھیں، پوتا تو پورا کا پورا ہی نند کا تھا۔ ایک دن اماں نے چار عورتوں میں بیٹھ کر کہا بھی:۔

"اب رفو بیگم جانیں اور شمیم میاں۔ میں نے تو ان کی گود میں ڈال دیا۔ اب وہ ان کی ماں ہیں اور وہی ان کے بیٹے۔"

رفو بیگم کا دل جیسے اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں آنکھوں سے نکل پلکوں پر کپکپانے لگا۔ "میرا بیٹا! میرا بچہ ——!"

شمیم میاں ڈھیر ساری بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ کوئی انھیں پوچھتا نہ پوچھتا، ماں اور دادی کی تو آنکھوں کے تارے تھے ہی تھے۔ بس کڑوا کریلا نیم چڑھ گیا۔ ابھی ایک برس کے بھی نہ ہوئے ہوں گے، ضد کا وہ عالم تھا کہ کسی چیز کی پے میں پڑ جاتے تو مچل مچل کر زمین آسمان سر پر اُٹھا لیتے۔ بڑے ابّا ایک بار کہیں شیشے کا ایک گلدان لائے تھے۔ قیمتی اتنا نہ تھا جتنا خوبصورت تھا۔ اور پھر جب چیز پرانی ہو جائے اور وہ کسی بزرگ کے ہاتھ کی لائی ہوئی ہو تو وہاں قیمت کا سوال رہ بھی نہیں جاتا، وہ ایک قابل احترام چیز بن جاتی ہے۔ ایک دن کہیں شمو میاں نے وہ گلدان دیکھ لیا، ڈیڑھ پونے دو برس کے ہو رہے تھے۔ کھڑے تو ہوتے ہی تھے، ذرا دور تک چل بھی لیتے تھے۔ گلدان سنگھار میز کے پرلی طرف رکھا ہوا تھا۔ پھدپھداتے ہوئے گئے اور گلدان اُٹھا لیا۔ قریب تھا کہ زمین پر دے مارتے کہ تائی بی

نے دیکھ لیا اور چلا کر دوڑیں :۔
"ہئے ہے ابا میاں کے ہاتھ کا لایا ہوا ہے"
ہاتھ سے گلدان چھینا تھا کہ شمو نے چیخ چیخ کر حالت تباہ کر لی۔ لاکھ کھلونے دیئے جا رہے ہیں، لالچ دیا جا رہا ہے، مگر بہلائے نہیں بہلتے۔ منجھلی پھوپھی کہیں باورچی خانے میں ان کے دودھ دلیے کی برابری کر رہی تھیں۔ وہاں سے چیخ چانخ سُن کر لپکی آئیں۔
"ہوا کیا؟" وہ تیزی سے بولیں، "ذرا چھوڑ کر جاؤں تو جیسے سب اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آخر بن ماں کا ہے۔"
تائی تنک کر بولیں :۔ "بن ماں کا ہے تو جو چاہے کر لینے دیں؟ ابھی گلدان توڑ دیا ہوتا۔ کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں۔"
پھوپھی کو دیکھ شمو اور زور زور سے رونے لگا۔ رفو بیگم نے آگے بڑھ کر گلدان اس کے ہاتھ میں تھما دیا، اور دوسرے ہی لمحے خوشی خوشی شمو نے تڑ سے زمین پر دے مارا۔ معصوم مسرت کا سارا راز اسی تڑ میں پوشیدہ تھا۔
سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ تو سر سے اونچی جا رہی ہیں۔ ایسے تو بن ماں کے بچے کو ڈیڑھ کوڑی کا کر دیں گی۔ کیا بچے کی ضد ایسے ہی پوری کی جاتی ہے!؟
دادی اماں کے کانوں تک شکایت جانے سے پہلے ہی منجھلی پھوا نے ایک نہ دو چار گلدان منگوا کر میز پر سجوا دیئے۔
یہ پہلا وقت تھا جب منجھلی پھوپھی کا دل پوری طرح ایک ماں کی طرح تڑپا تھا اور وہ اپنے جگر گوشے کے لیے سب سے لڑنے پر آمادہ ہو گئیں تھیں۔ یہ ایک ننھی، بالکل ہی ننھی سی بات تھی، مگر جیسے جیسے شمو بڑا ہوتا جا رہا تھا، پھوپھی کی محبت دیوانگی اختیار کرتی جا رہی تھی ان کی زندگی نے محبت کا لفظ سنا ہی نہ تھا، محبت کرنے، چاہنے اور چاہے جانے کی اس لذت سے وہ یکسو محروم تھیں جو کبھی تو بیوی بن کر ملتی ہے اور کبھی ماں بن کر۔
شمو اپنی بہنوں میں گھرا بیٹھا تھا۔ چھوٹی سی جان، نہ کسی بات کی سمجھ، نہ اپنے پرائے کی تمیز۔ سب بچیاں کھیل رہی تھیں۔ چھپا چھپائی کا کھیل ہو رہا تھا۔ ٹھولا ٹھالی بھی چل رہی تھی، کسی نے سر پر ایک دھول جمائی۔ اس نے ادھر اُدھر سر گھما کر دیکھا اور پھر

بے بسی سے پکارا :۔

"امی"

رفو پھوا دالان میں کرسی پر سویٹر بُنتی بیٹھی تھیں۔ اس کے اس طرح پکارنے پر پہلے تو وہ چونکیں، پھر ان کا پورا وجود تھرّا گیا۔ امی۔ امی۔ امی۔

آج ایک ننھے سے وجود نے اپنی زبان سے پہلی بار ایک لفظ ڈھالا تھا، اور وہ لفظ تھا امی! اور امی کون تھی؟ سویٹر پھینک کر وہ لپکیں اور قریب پہنچتے ہی رُک کر بے تابی سے شمّو کو اپنے سینے میں بھر لیا۔

"میں تیری ماں ہوں۔ ہاں تیری ماں ہوں۔ ایک بار پھر امّی کہہ دے۔ کہہ دے میرے بچّے! میرے بیٹے!"، سینے سے اُبال سا اُٹھ رہا تھا۔ وہ پھپک پھپک کر روئے جاتی تھیں اور شمّو کو اپنے سینے سے بھینچے جاتی تھیں۔ آج ایک معصوم وجود نے اُنھیں فرش سے اُٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا۔ آج تک وہ ایک عام عورت تھیں۔ مگر اب اُن کے قدموں تلے بھی ایک جنت تھی۔ ہاں وہ ایک ماں تھی!

ایک ماں کا نازک اور موم دل لئے اب وہ دھیرے دھیرے قدم اُٹھانے لگیں کہ کہیں ان کے پیروں تلے کسی کا معصوم دل کچل کر نہ رہ جائے۔ ماں بننے کی پہلی پہلی لذّت سے گزر کر اب وہ اس دور سے گزر رہی تھیں، جب کہ ان کی اولاد نے اُنھیں ماں کہہ کر پکار بھی لیا تھا۔ اب ان کے سینے میں بجائے گوشت پوست کے دل کے، کانچ کا دل تھا، جو ہلکی سی ٹھیس سے بھی چور چور ہو جاتا تھا۔

رفو پھوپی سے اب نہ ممکن تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے وجود سے، اپنے دل سے، اپنی آنکھوں سے اپنے راج دلارے کو اوجھل کرتیں۔ ان کی سسرال سے ایک بار کسی عزیزہ کی شادی کا بلاوا آیا۔ انکار کرتیں تو کیسے؟ سسرال کا معاملہ تھا۔ اور شمّو کو ساتھ لے جائیں تو کیسے؟ وہ تو انھیں امی کہتا تھا! اگر کوئی الٹی سیدھی بات منہ سے نکال دیتا، تو چار لوگوں میں کیا عزّت رہ جاتی؟ اکیلا پن کیسے برداشت کرتیں؟ مگر ٹال نہ سکیں اور اکیلے ہی جانا پڑا۔ گئی تھیں کہ رات ہونے سے پہلے ہی آجاؤں گی، مگر وہاں وداعی میں اتنی دیر تھی کہ تارے کھل گئے، چاند چمک اُٹھا۔ ان کے اپنے دل میں بھی

چاند کا عکس تھا اور آنکھوں میں تارے۔ لاکھ ناں۔ ناں کی مگر رکنا ہی پڑا۔

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے چلنے کی سوچی۔ رات بھر نیند ہی کہاں لگی تھی جو اٹھنے نہ اٹھنے کا سوال پیدا ہوتا۔ وہ تو گھڑیاں گنتی بیٹھی تھیں۔ اسی جاگل نے ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں گلابی ڈورے ڈال دیئے تھے، نیند کا نشہ الگ، جاگی جاگی آنکھوں کی گلابیاں رہیں سو الگ ان کی سوئی سوئی جوانی جیسے آج گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھی تھی۔ انگ انگ چٹخا پڑ رہا تھا۔ اور جس وقت وہ چارپائی سے اتری ہیں اور زمین پہ پاؤں رکھا ہے، ایک لمحے کو خود انہیں یہ محسوس ہوا، جیسے چٹ سے زمین ان کے وزن سے چٹ چٹ بول جائے گی۔

ملگجی ساری کے آنچل سے سر کو ڈھانپے قاتل آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتی، نوکر کو کھوجتی پھرتی تھیں کہ سامنے سے اشرف آتا دکھائی دیا۔ اس نے پہلے تو یوں ہی لاپرواہی سے دیکھا، مگر ایک نگاہ جو پڑ گئی تھی، جیسے چپک کر رہ گئی۔ یہ رفو بھابی تھیں؟ رفو بیگم؟ رفو دلہن؟ رفو بیوہ؟ کتنے برس بیوگی کو ہو رہے تھے؟ پرانے خیالات رکھنے والے لوگوں سے یہ کہاں ممکن تھا کہ اس قسم کی بات کا تصور بھی کر سکتے کہ بیوہ بہو کو پھر سے بیاہ لائیں۔ کیا ہوا اشرف اگر مرنے والے کا چچازاد بھائی تھا؟ تھا تو ہر لحاظ سے قابل! اتنے دن گزر گئے مگر اشرف نے بھی کہیں شادی نہ کی تھی۔ یہ تو نہ تھا کہ دل میں بس رفو کی یاد کا دیپ جلائے ہی بیٹھا ہو، مگر سوچا ضرور تھا کہ اگر یہ چراغ اسی کی تاریک کٹیا میں جل اٹھتا تو؟

ایک قدم — دوسرا قدم — تیسرا قدم۔ رفو عمر کے اس دور میں تھی، جب پھل کچے پن کی حدوں سے گزر کر پکنے لگتا ہے۔ گدرایا، گدرایا سا، رس بھرا، اور پہلے سے کہیں میٹھا۔ آنکھیں اُف یہ آنکھیں! شاعر ایسی ہی قاتل آنکھوں پر شعر کہتے ہوں گے۔ آنگن میں پلنگ ہی پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ سارے میں سوتا پڑا ہوا تھا، کوئی کروٹ لے رہا تھا۔ کوئی کسمسا رہا تھا۔ اشرف کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا، لپک کر آگے بڑھا اور بے چینی سے یوں بولا: جیسے برسوں سے یہی ایک بات کہنے کو بے چین تھا:۔

"رفو، اکیلی کب تک زندگی بسر کرو گی؟ یہ سفر تو بہت ہی لمبا ہے اور تمہارے ساتھ تو کوئی دوسرا ساتھی بھی نہیں۔"

رفو ایک لمحے کو سر سے پاؤں تک تھرتھرا اٹھی۔ بیوگی کے اتنے سارے بھیانک

سال ۔۔۔ روتے گاتے، آنسو بہاتے، سسکتے ہوئے لمبے اور اُکتا دینے والے سال ۔ اس کی آنکھوں کے آگے سے ایک لمحے میں گزر گئے ۔۔۔ سہارا ؟
قبول کروں ؟ ساتھی بنا زندگی کٹتی بھی تو نہیں ۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی ۔ ادھر روتے سسکتے اتنے سارے سال اور محرومیاں تھیں، جوان زندگی اور بے خواب راتوں کے جان لیوا ستم تھے اور اُدھر ایک ننھا مُنا چاند تھا، ہنستا مسکراتا ۔ امی ! امی !

وہ چونکیں، پھر بڑے رسان سے، دھیمے سروں میں بولیں :۔
" آپ غلط سمجھ رہے ہیں اشرف بھائی ۔ مجھے زندگی سے اب کوئی گلا نہیں ۔ میں نے تورانی کے بچے کو گود لے لیا ہے "
ایک پھول کے لئے رفو پھوپھی سارے بھرے پُرے باغ کو ۔۔ لہلہاتے باغ کو، ہنستے مسکراتے، لہکتے مہکتے باغ کو، ٹھکرا آئیں ۔ اب ان کا دماغ شمو کے علاوہ اور کسی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا، عورت محبت کرنے پر آتی ہے تو اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے، چاہے وہ اولاد ہو یا شوہر ۔ اپنا ہو یا پرایا، بس دل کی بات ہے، عورت نے دنیا میں شکست ہمیشہ اس محبت اور ممتا بھرے دل کے ہاتھوں ہی کھائی ہے !
دن ایسے ہی سر سر گزرے جا رہے تھے ۔ اپنی جوانی اور حسن کی ساری رعنائیاں رفو پھوپھی نے جیسے شمو کو دے ڈالیں، ابھی ابھی وہ گھٹنوں چلتا تھا، ابھی ابھی اس نے اپنے گلابی اور نرم ہونٹوں سے رفو پھوپھی کو امی کہہ کر پکارا تھا، ابھی ابھی وہ اپنی تین پہیوں والی سائیکل پر بیٹھ کر مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا، ابھی ابھی اس نے اپنا بستہ اُٹھایا تھا، اور قاعدہ اُٹھا کر الف بے اور اے، بی، سی، ڈی پڑھا تھا؛ ابھی ابھی اس نے گلابی چہرے اور ہنستی آنکھوں کے ساتھ آکر اپنی امی کو سنایا تھا :۔
" امی امی میں چھٹی کلاس میں فرسٹ آیا ہوں " ابھی ابھی اس نے میٹرک میں فرسٹ کلاس فرسٹ آکر اُستادوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا اور ابھی ابھی وہ کالج سے سائیکل پر واپس لوٹا تھا ۔ اور بڑے پیار سے اپنی امی سے کہہ رہا تھا ۔
" امی، آپ نہیں سمجھتیں، آپ کی وجہ سے مجھے کتنی فکر لگی رہتی ہے ۔ بھلا کوئی بات بھی ہے کہ میں اتنا بڑا ہو کر یوں آپ سے کام لوں ؟ کیا میں ایک چائے کی پیالی بھی اپنے ہاتھوں

نہیں بنا سکتا۔ ؟"

رفو پھوپھی مسکرائیں: "بیٹے تو نہیں جانتا، تیرا کام کر کے، تیری ہنستی صورت دیکھ کر میرا دل کتنا بڑھ جاتا ہے۔ آخر ایک ماں اور اپنے بچّے کے لئے کر ہی کیا سکتی ہے؟"

اک دم شمو ذرا رکا اور آہستگی سے بولا: ۔"امی آپ ہی میری امی ہیں نا؟"

رفو پھوپھی نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور بولیں: "کیوں اس میں تجھے کوئی شک ہے؟ وہی چڑیلیں زرینہ، شاہینہ وغیرہ تجھے ستا رہی ہوں گی نا؟"

"نہیں امی، شمو ہنس کر بولا، ویسے تو سب ہی کہتے رہتے ہیں، آج کل سے نہیں بہت زمانے سے کہ آپ میری امی نہیں پھوپھی ہیں۔"

"تو اس میں کیا فرق پڑتا ہے پگلے؟ بہر حال میں تیری ماں تو ہوں نا؟ کیا اتنی بات تیرے لئے کافی نہیں ہے؟"

شمو کا چہرہ اتر سا گیا۔ روہانسا ہو کر بولا:۔

"امی ایسی بات نہ پوچھیے۔ دادی اماں سُناتی رہتی ہیں کہ آپ نے میرے لئے کیا کیا کیا ہے۔ رات کو رات نہیں سمجھا، دن کو دن نہ سمجھا۔ اپنی زندگی کا ہر ہر لمحہ، ہر ہر سکھ میرے لئے صرف کر دیا۔ اور تو اور آپ نے اپنی ساری جائداد بھی میرے نام کر دی۔ سچ کبھی کبھار میں خود کو بے حد گناہگار محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا....."

رفو پھوپھی نے اک دم لپک کر اپنا سوکھا ہوا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"خدا کے لئے چپ رہ! شمو۔ ایسی بات کرتے تجھے ذرا سی شرم نہیں آتی۔ آخر میرے دل کا احساس کر۔ آخر میں کس کے لئے جی..... اور کس کے لئے مروں گی؟" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

شمو رکا اور بے لبی سے بولا! "کہنے جیسی بات تو نہیں ہے امی، گر واقعی آپ اپنی زندگی سنوار بھی سکتی تھیں۔ میرے وجود نے آپ کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔"

رفو پھوپھی تڑپ اُٹھیں: "شمو ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے۔" اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کا منہ بتا رہا تھا اور زندگی کا ہر بیتا لمحہ جیسے ٹھٹھک گیا تھا، سرک کر چیکار چکار کر کہہ رہا تھا: "سچ کہنا، کیا تمہیں کبھی بھی بیتے دنوں پر افسوس نہیں ہوتا؟ کیا اپنی پھولو

بھری جوانی کو یوں برباد کر کے تمہیں کوئی کڑھن نہیں ہوتی ؟"

اُس رات شمو نے جب جب بھی پڑھتے پڑھتے سر اُٹھا کر امی کے پلنگ کی طرف دیکھا، پلنگ کو ننھی ننھی سسکیوں سے لرزتا پایا!

شمیم میاں ایم، بی، بی، ایس کے تھرڈ ایر میں تھے کہ ان کی لیلیٰ بچھڑ گئی۔ اُڑتے اُڑتے یہ بات رفو پھوپھی کے کانوں تک بھی آئی۔ رفو پھوپھی کے دل کو کیا کیا ارمان لگے ہوئے تھے۔! انھوں نے تو طے کر رکھا تھا کہ کسی اپنے شریف خاندان کی بے حد پڑھی لکھی اور سگھڑ لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گی۔ زندگی نے جو جو ستم ان کے ساتھ کئے تھے، گن گن کر ان ظلم و ستم کا بدلہ لیں گی اور بہو بیٹے اور پوتے پوتیوں سے بھرے پُرے آنگن میں بیٹھ کر ہنستی ہنستی ہی اس دنیا سے دوسری دنیا کو جائیں گی۔ مگر لکھا تھا کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی۔ کیوں کہ شمو میاں نے جس جگہ دل لگایا تھا وہاں کسی کی مرضی نہ تھی۔ پتہ نہیں اپنے کون سے پروفیسر کی لڑکی پر ریجھ گئے تھے، خاندان کی بات تو جانے ہی دو، بٹیا رانی ابھی میٹرک بھی نہ کر سکی تھیں اور مزے سے سائیکل پر دوپٹہ اڑاتی اسکول آیا جایا کرتی تھیں۔

اگر صرف رفو پھوپھی کا واسطہ ہوتا تو شمو میاں کو اتنی لگ لگاہٹ بھی نہ ہوتی، مگر یہاں تو پورے خاندان سے ٹکر لینے کا سوال تھا اور پھر ابھی تعلیم بھی ادھوری تھی اور نوکری کا کوئی ٹھاٹھ ٹھان ہی نہ تھا۔ یوں پیسہ تو اتنا تھا کہ چاہتے تو چار لوگوں کو کھلاتے تب بھی عمر بھر گھر بیٹھے کھا سکتے تھے، مگر گھر بیٹھا مرد بھی کہیں بھلا لگتا ہے۔

رفو پھوپھی لاکھ بے خبر تھیں، مگر چہرے کی اُڑی اُڑی رنگت اور بہکی بہکی چال ڈھال سے بھانپ گئیں کہ شمو میاں نے ضرور کہیں جی اٹکا لیا ہے۔ ادھر اُدھر سے پوچھ تاچھ کی، ان کا خیال غلط نہ تھا۔ اماں بیگم کی سرکار میں جب پہنچی ہوئی تو وہ کفن پھاڑ کر چلا اٹھیں۔ اور اُلٹے جب رفو پھوپھی نے ہی بیٹے کی پشت پناہی کی تو وہ چلا اٹھیں:—

"جائداد کا حبہ حبہ بھی آگے ہی اس کے نام کر دیا ہے۔ اور اوپر سے بہو بھی وہ اونچے خاندان کی لا رہی ہے۔ اری دیکھنا، تجھے دانے دانے کو ترسا دیں گے۔ پتہ نہیں اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ اونچ نیچ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ عمر جیسی عمر ایسی ہی ناسمجھی کو گزار دی۔"

مگر رفو پھوپھی چین سے نہ بیٹھ سکیں۔ عشق تو شمو میاں نے کیا تھا، ہجر و فراق کے

اثرات ان کی صورت سے ہویدا تھے۔ رنگ پیلا، اُلجھے سُلجھے بال، ہونق چہرا، کوئی دیکھتا تو یہی کہتا اب سنب ہو رہی ہیں۔ اس ضد منڈی میں سال بھر نکل گیا، مگر شمو میاں کا جی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ وہی ایک لگن تھی، وہی ایک رٹ، تھک ہار کے بڑے بوڑھے بھی چپ ہو رہے۔ تیز ہوا کے جھکڑ کے آگے گھاس پوس ٹکتا بھی کب ہے؟

رفو پھوپی نے اپنے جہیز اور چڑھاوے کے سارے جوڑے اور زیور اُٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ بڑے جتن سے تمام چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گوٹے کناری پر نیا کپڑا لگوا رہی تھیں اور زیور کے فیشن بدل چلے تھے۔ توڑ یز ان بدلوانے پر مصر تھیں۔ رہی سہی ساری پونجی اُنھوں نے شادی کے ہنگاموں پر لگا دی۔ وہ سچ مچ کی ماں نہیں تھیں تو کیا ہوا؟ ان کے سینے میں ماں کا دل تو دھڑکتا تھا! یہ وہی تو تھیں نا جنھوں نے رات رات بھر جاگ کر، روئی کی بتی بنا بنا کر اپنے شمو کو دودھ پلایا تھا، اس کی دیکھ ریکھ کی تھی۔ نوکروں کی فوج ہونے کے باوجود ارمانوں کے ساتھ خود ہی تو موت کے بھرے پوتڑے، رُمالیاں دھوتی تھیں۔ یہ وہی تو تھیں نا جنھوں نے شمو کی ہلکی سی بیماری پر اپنے آپ پر رات رات بھر کی نیند حرام کر لی تھی۔ یہ وہی تو تھیں نہ جنھوں نے اپنی زندگی کی ہر ہر خوشی، ہر ہر سکھ، ہر ہر پیار بھرا لمحہ شمو پر قربان کر دیا تھا۔ کیا ایک ماں اس وقت ماں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے سینے سے ایک بچے کو دودھ پلا دے؟ کیا محض اپنے بطن سے جنم دینے والی ہی ماں کہلا سکتی ہے؟ زندگی کی ساری خوشیاں نثار کر دینے والی دُکھی روح کو پھر اور کیا نام دیا جا سکتا ہے؟ کیا سات آسمانوں کے اوپر رہنے والا اتنا نا انصاف تھا کہ وہ اُنھیں ماں پن کی لذت سے محروم کر دیتا؟

شادی کے دن رفو پھوپی کی خوشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اپنے ہاتوں اُنھوں نے ہر ہر کام نپٹایا تھا۔ مہمانوں، رشتہ داروں، دوستوں، نوکروں سے گھر بھرا پڑا تھا مگر وہ ہر ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے، اپنی خوشی سے کرنا چاہتی تھیں۔ کیا ہوا جو شمو نے ان کی پسند سے شادی نہ کی۔ زندگی کسے گزارنی تھی، شمو کو یا اُنھیں؟ یہ تو اچھا ہی تھا نا کہ میاں بیوی نے ایک دوسرے کو دیکھ پہچان کر ہاتھ بڑھایا تھا، پھر وہ اپنے جگر گوشے کی خوشی پر کیسے نہ خوش ہوتیں۔

شادی پورے زور شور سے ہوئی۔ بارات بینڈ باجے کے ساتھ دلہن دلہا کو لے کر گھر آئی۔ راستہ بھر آتشبازیاں چھوٹتی رہیں اور رفو پھوپی خود اپنے ہاتھوں پیسے لٹاتی رہیں۔ آج کوئی رفو پھوپھی

کی خوشی دیکھتا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے چہرے پر جوانی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ وہ رہ رہ کر مسکراتیں، ان کے پژمردہ اور پیلے چہرے پر آج گلابیاں اُمڈ رہی تھیں۔

دلہن کا کمرہ بھی خود انھوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔ پھولوں کی بہتات سے کمرے پر کسی خطۂ باغ کا گمان ہو رہا تھا۔ مقیش کے تاروں اور چاندی کے پتلے پتلے پھولوں سے مسہری جگ مگ کر رہی تھی۔ چھپر کھٹ پر دُلہن سر نیہوڑائے بیٹھی تھی اور رفو پھوپھی آتے جاتے، پُر مسرت انداز سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کب چاند چڑھے اور یہ کلی پھول بن کر مہکے۔

کھانے دانے اور ریت رسموں سے فارغ ہوئے پر جب دولہا کو اوپر لایا گیا تو اچانک رفو پھوپھی نے محسوس کیا کہ سہرے کی لڑیوں میں سے جھانکتا ہوا شمو کا چہرہ کچھ اداس اداس سا نظر آ رہا ہے۔ آج کا دن ــــ مسرتوں، ارمانوں، آرزوؤں کا دن ــــ اور شمو کے چہرے پر پژمردگی؟ وہ بے کل بے کل سی، بولائی بولائی سی اِدھر اُدھر پھرنے لگیں، کہ بھیڑ چھٹنے اور موقع ملے تو وہ شمو سے کچھ بات کریں۔ مگر دُلہن دولہا کے آس پاس وہ جھورجھما کا تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے بجتے سب ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو سلایا۔ مہمان بیبیاں موقع پا پا کر اپنے جھروکوں میں گھسیں۔ باجے والوں نے شطرنجیوں اور ٹاٹوں میں لپیٹ لپیٹ کر باجے رکھ دیئے اور چھت خالی ہو گئی۔

شمو اکیلا کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا، دُلہن اندر کمرے میں تھی۔ رفو پھوپھی بے تابی سے لپکی ہوئی آئیں اور چھوٹتے ہی بولیں:۔

"میرے لال! کیا بات ہے؟ چہرہ یوں اُترا اُترا سا کیوں ہے؟"

نسیم صاف ٹال گیا اور چہرہ نیچا کر کے بولا:۔

"کوئی بات نہیں امی۔ آج تو میں حد سے سوا خوش ہوں۔ آپ جی نہ کڑھائیے"۔

مگر رفو پھوپھی کا جی نہ مانا، وہ گلے کا ہار ہو گئیں، اور قسمیں دے دے کر اس کی اداسی کا سبب پوچھنے لگیں۔ نسیم نے جیسے حلق میں پھنسا ہوا گولہ نیچے اُتارا اور اٹک اٹک کر بولا:۔

"نہیں امی بس یہی سوچ رہا تھا کہ اگر آج میری اماں ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں"

"میری اماں!"

"میری اماں !"

"میری اماں !"

رفو پھوپھی کا سر گھومنے لگا۔ زمین، آسمان، سب گھومنے لگے۔ تاروں بھرا آسمان چکر کھانے لگا۔ پھولوں بھری زمین چکر کھانے لگی۔

اُنھوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر ہر لمحہ وہ بے سدھ ہوتی جا رہی تھیں۔ چٹ سے ان کو اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو پکڑنا چاہا، مگر اسی لمحے ان کے ہاتھوں کا سارا زور ختم ہو گیا، اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑیں......"



"اب چراغ بجھا کر سو جاؤ" نیند ہی میں ماں بڑبڑائی۔ رات دس بجے کے بعد بتی جلائے رکھنا اُسے پسند نہ تھا لیکن اُس کی سُنتا کون تھا۔

"اچھا ماں جی! تم سو جاؤ ——" پنکجم بول اُٹھی۔

دفتر سے واپس آتے ہی وہ ایک جاسوسی ناول لے بیٹھی تھی اور ابتدائی ہی صفحات میں کسی کا خون ہو چکا تھا۔ بتدریج اضطراب بڑھ رہا تھا اور خونی کی شخصیت پر پڑے ہوئے پردے کو اٹھانے کی خواہش بھی بڑھ رہی تھی۔ مصنف کا انداز بیان رونگٹے کھڑا کر دینے والا تھا اور ساتھ ہی بیحد دلچسپ بھی —— ساڑھے دس بج گئے لیکن اب تک وہ خونی کا پتہ نہ لگا سکی۔ خونی کا پتہ لگائے بغیر اُسے نیند کیسے آتی۔

پنکجم نے ماں سے کہہ دیا "ماں جی! تم سو جاؤ۔" لیکن منگلم بے خبر سی دفتر کی فائلوں میں اُلجھی ہوئی تھی۔ اُس نے ماں کا حکم ہی سُنا اور نہ پنکجم کا جواب ہی —— دفتر کے کام کا آغاز تو صبح دس بجے ہوتا ہے لیکن اختتام —— ؟ یہ سوال ہی غلط ہے۔ دو سَو روپے تنخواہ دے کر سرکار نے جیسے اُسے خرید لیا ہے۔ برسوں کی جی توڑ محنت نے اُسے ہیڈ کلرک بنا دیا تھا۔ بس اب آگے بڑھنے کے لئے زینہ ہی نہیں پچیس سالوں تک اُسے ہیڈ کلرک ہی بنی رہنا پڑے گا۔ فائل کے سفید، پیلے اور بادامی کاغذات ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں میں چبھ رہے تھے۔ ایک فائل کو پورا کر کے بادلِ ناخواستہ دوسری فائل اُٹھاتے وقت اُسے آرام کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کرسی پر بیٹھے

بیٹھے اُس نے نظر گھمائی۔

اِس کُنج میں ماں جیسے ایک خشک ٹہنی تھی! چار لڑکیوں کی ماں ہونا باعثِ خیر و برکت ہے یا گناہ؟ اس سوچ میں نہ پڑ کر بے فکری سے سوئی ہے۔ اُس کے سرہانے دائیں طرف ابھیم گہری نیند میں ڈوبی ہے۔

ابھیم کو صرف آٹھ گھنٹے کام کرنا پڑتا ہے۔ صبح چھ بجے جا کر ڈھائی بجے لوٹتی ہے پھر تھوڑا دہی چاول کھا کر آرام سے لیٹ جاتی ہے۔ اُسے گھر پر بھی دفتر کا کام نہیں کرنا پڑتا۔ مسافروں کو ٹکٹ دے کر روپیوں کا حساب ہیڈ کلرک کو دے دینے سے اُس دن کی اُس کی تنخواہ پکی ہو جاتی ہے۔ سینما دیکھنے، ناول اور اخبارات پڑھنے کا اُسے شوق نہیں ہے۔ نیند کی دیوی کی گود سے کوئی طاقت اُسے اپنی طرف کھینچ نہیں سکتی۔ لیکن اِدھر اُدھر کی باتوں میں اور دوسروں کی نکتہ چینی کرنے سے اُسے بڑی دلچسپی ہے۔ آخر چوبیس[24] سال کی جوان لڑکی کو کسی نہ کسی موضوع میں دلچسپی تو ہو گی ہی۔

ابھیم کے بستر کے آگے پنکجم کا بستر —— ایک دری اور ایک تکیہ —— پیروں کی طرف سفید اور کالے رنگ کی دھاری دار چادر تہہ کر کے رکھی تھی۔ پنکجم کی ہر چیز صاف ستھری رہنی چاہیے۔ وہ ایک برطانوی فرم میں اسٹینو تھی۔ مہنگائی بھتہ سب ملا کر دو سو[200] روپے ماہوار، ساتھ میں تین ماہ کا بونس بھی —— دفتر میں شروع کئے ناول کو گھر آکر پورا پڑھ لیتی۔ تمبو چیٹی گلی کی پرانی کتابوں کی ایک دوکان میں ایک روپیہ جمع کرنے سے ایک کتاب پڑھنے کو مل جاتی۔ پڑھ کر لوٹاتے وقت دس پیسے اور ادا کرنے پڑتے۔ روزمرہ کے خرچ کے علاوہ دس پیسے کا اور خرچ!

ہال کا آدھا حصہ ابھی خالی ہی تھا۔ پنکجم سے کچھ دور دو بستر اور ہیں۔ ایک ابھی بچھا نہیں تھا۔ دفتر کا کام پورا کر کے تھکن سے چور منگلم اُسے بچھائے گی۔ دوسرے بستر پر وسالم —— سب سے چھوٹی بہن کروٹیں بدل رہی تھی۔ کالج کی تعلیم پوری کئے اُسے چھ[6] مہینے ہو گئے تھے۔ دو ماہ بعد اُسے یونی ورسٹی سے بی۔ اے کی سند مل جائے گی۔ اس خاندان کی پہلی گریجویٹ!

لمحہ بھر کے لئے منگلم کا دل رو اُٹھا۔ وسالم پیدا ہوئی تو وہ دس سال کی تھی۔ دو ماہ پہلے ہی ان سب کو بے سہارا چھوڑ کر اُس کے باپ چل بسے تھے۔ میکانکی طور پر ماں نے وسالم کو جنم تو دے دیا تھا لیکن اُس کے پیدا ہونے کے بعد وہ گہری فکر میں ڈوب گئی تھی۔ دس، سات اور تین سال کی تینوں بہنیں اُس وقت کی صورتِ حال کو سمجھ سکنے کے قابل نہ تھیں لیکن اُس خوفناک حالت کو

منگلم بخوبی سمجھنے لگی تھی۔ کچی عمر اور ناتجربہ کار ذہن ——— مرحوم شوہر کے غم میں گھلتی ماں۔ اُن کی نشانیوں ——— ان چار بچوں سے بے پرواماں! اُسے کون سمجھائے؟ اُس دن سے منگلم ننھی وِسالم کو سنبھالنے لگی اور آج بھی وِسالم اُسی کی بغل میں سوتی ہے۔

منگلم وِسالم ہی کو دیکھتی رہی۔ اس بھادوں میں اُس کی عمر کے اُنیس 19 سال پورے ہو جائیں گے۔ اور پھر ——— ؟ پھر کیا ——— ؟ کیا بڑی بہنوں کی طرح اُسے بھی نوکری کی تلاش میں نکلنا ہوگا؟ تینتیس 33 سالہ منگلم محکمۂ زراعت میں ہیڈ کلرک ہے۔ اُس سے تین سال چھوٹی پنکجم اسٹینو ——— اپنی طرف بڑھتے ہاتھوں میں اَن دیکھے گاؤں کے ٹکٹ تھماتی ہوئی اَمبیم ——— ان تینوں ہی کی طرح کیا وِسالم کو بھی؟ دفتر کی فائلوں میں منگلم کا دل ذرا بھی نہ لگا۔ اُس دل میں تو وِسالم سمائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں وِسالم ہی پر مرکوز تھیں۔ دُبلا پتلا جسم آم کی کونپلوں جیسا رنگ۔ جوانی کے اُبھار سے پھولا ہوا شگفتہ چہرہ ——— محنت و مشقت سے ناآشنا ملائم ہاتھ پاؤں۔ دنیا کے دُکھ درد اور تلخیوں سے ناواقف ملائم دل ——— کیا وِسالم کو بھی اپنی بہنوں ہی کی طرح اُس لامحدود سفر کے لئے نکلنا ہوگا ——— ؟ جوانی کی خواہشوں اور خوشبوؤں کو گھول کر، تمنّاؤں کا خون کر کے، عمر کی پختگی کا بوجھ لئے بُجھی بُجھی آنکھیں اور جذبات سے عاری جسم ہی اُس کا سرمایہ اور اثاثہ رہے گا۔

منگلم کے گال گول مٹول اور اُبھرے ہوئے نہیں تھے۔ ماتھے پر جھرّیاں نہ ہونے پر بھی ایک طرح کی سیاہی چھا چکی تھی۔ روز بروز جھڑتے ہوئے بال تِل کا رنگ دھار چکے تھے ——— بس پانچ چھ سالوں بعد تو انھیں باندھ کر ہی رکھنا ہوگا۔

پنکجم دن پر دن موٹی ہوتی جا رہی ہے۔ سدا بیٹھے بیٹھے کام کرنے سے اور کیا ہوگا؟ میری زندگی جوانی کے موڑ پہ آتے ہی ختم ہو گئی۔ یہی سوچ کر وہ اس نئی زندگی کی رفتار کو روک کر، گو نہ بیخودی حاصل کرنے کے لئے، جاسوسی ناولوں کا سہارا لیتی ہے۔ اُس کی فطرت ہی نرالی ہے۔ ماضی کی طرف مُڑ کر دیکھنے کی عادت اُس میں نہیں ہے

اَمبیم اپنی تنخواہ کے بارے میں بھی بے پروا ہے۔ حد سے زیادہ بے پروائی ——— بے غرض اور بناوٹ سے پاک باتیں۔ ان چار بہنوں میں سب سے زیادہ بھولی لڑکی ——— دل پر پردہ ڈال کر بات چیت کرنا اور باتوں کے دوران یکایک مشتعل ہو کر ناراض ہونے کا سبب؟ ہرے بھرے درخت کی شکل لے کر بھی وہ پھول پھل نہ سکی اور اسی سے گھُل گھُل کر اپنی شاخوں کو توڑ مروڑ کر خود تڑپ تڑپ کر برباد ہو رہی ہے اَمبیم!

کیا یہ تینوں کم ہیں؟ کیا وِسالم کو بھی اب اِنھیں میں شامل ہونا ہوگا؟ پل بھر کے لئے اُس کا دل اپنے مرحوم باپ کو کوسنے لگا۔ جنم تو دیا لیکن پروان چڑھا کر ہونہار اور قابلِ اعتماد ہاتھوں میں نہ سونپ کر وہ انھیں منجدھار میں چھوڑ گئے تھے۔ بے چاری ماں کا کیا قصور؟ انشورنس، بچی کھچی پونجی اور زیوروں ہی کے سہارے وہ اپنی لڑکیوں کے پیٹ کی آگ بجھا سکی تھی۔

ان تینوں ہی کی طرح اب وِسالم بھی —— نہیں —— اُسے اِن تینوں سے بڑھ کر رہنا ہوگا۔ کم از کم زندگی کی تکمیل کا احساس تو اُسے ہو —— زندگی کے سبھی سُکھ اُسے میسر ہوں۔ عورت کی ذات کے وجود میں آنے کے مقصد کا تو اُسے احساس ہو۔

منگلم اُٹھ کر وِسالم کی بغل میں رکھے بستر کو بچھا کر لیٹ گئی۔ خونی کا سُراغ لگتے ہی اُسے پھانسی کی سزا ہوگی یا حبس دوام کی ——؟ یہ جاننے کی خواہش میں سنگیجم ابھی تک اپنے ناول میں کھوئی تھی۔

اُس دن مہینے کا دوسرا ہفتہ تھا —— ماں اور منگلم ہی گھر میں تھیں۔ کالج کی زندگی ختم ہو جانے کے بعد بھی وِسالم گھر پر نہیں رہتی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد آنگن میں ماں آم کی قاشیں سُکھا رہی تھی کہ منگلم نے پکارا —— "ماں!" —— اُس کی آواز میں ایک نیا پن تھا۔

"کیا ہے منگلم؟"

"ماں، کچھ دنوں سے تم سے کچھ کہنا چاہتی تھی ——"

اس تمہید کو سُن کر ماں سہم گئی۔ ہر بات کو سلجھا کر صاف صاف کہہ دینے والی منگلم اگر تمہید باندھے تو ضرور کوئی سنجیدہ ہی بات ہوگی۔ المیلو چپ تھی لیکن اُس کی آنکھوں نے پوچھا —— کیا بات؟

"اپنی وِسَو کے بارے میں تم نے کچھ سوچا ہے ماں؟"

"اُس کے بارے میں سوچنے لائق ہے ہی کیا؟"

"بہت کچھ ہے ماں!"

"تم تینوں گوری ہو، وہ کچھ سانولی ہے۔ وہ میری طرح ہے۔ اسے کالی بھی کہا جا سکتا ہے۔"

"ماں! میں اُس کے رنگ کے بارے میں نہیں کہہ رہی ہوں۔"

"پھر —؟ پھر کیا بات ہے تو ہی بتا نا ؟"

"اپنے دفتر کے ہیڈ کلرک کو میں اُس کی پیدائش کی تاریخ 'راشی' اُس کا ستارہ سب کچھ لکھ کر دے چکی ہوں، اُن کے ایک دوست بہت اچھے جیوتشی ہیں ماں۔ ! زائچہ چاہئے"۔

"کیا —ہے زائچہ —!! — ماں اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہاں ماں ! تیار بھی ہو گیا۔"

"اچھا !!"

"بس ایک اچھا سا رشتہ ڈھونڈھ کر —!"

"کیا بک رہی ہے ؟ تین بڑی لڑکیوں کے ہوتے اس کا بیاہ ؟"

"کیوں ؟ اس میں بُرائی کیا ہے ماں ؟ ہم تینوں کو کنواری دیکھ کر بھی جب دُنیا چپ ہے تو ہماری کوششوں سے وِستو کی شادی رچانے میں کوئی بُرائی نہیں ہے ماں !"

"اگر تیرے باپ آج ہوتے تو یہ بات سُن کر اپنے لئے پھانسی کا پھندہ تلاش کرتے۔"

"اُن کے ہوتے ہوئے بھی اگر ہماری یہی حالت ہوتی تو کیا وہ پھانسی لگا کر مرنے کی سوچتے؟ ماں ! تم صرف ہاں کہہ دو۔ ہم تینوں تو طے کر چکیں۔ تینوں کے دفتر سے قرض بھی ملے گا۔ بچت کے روپے، وہ ہمارے زیور ہیں ! بس تمھاری منظوری چاہئے۔"

"میں بڑی بدنصیب ہوں۔ ورنہ میرے رہتے تمھیں اتنی تکلیف نہ اُٹھانی پڑتی۔ !"

"ماں، ہم وِستو کو اپنی جیسی نہیں دیکھنا چاہتے۔ اُسے جینے دو ماں !"

"ایسا نہیں ہو سکتا منگلم ! جئیں گی تو میری چاروں بچیاں جئیں گی۔ چاروں پھولیں پھلیں گی، ورنہ چاروں مُرجھا جائیں گی۔"

"ماں ! تم ہم بہنوں کو آشیرواد دے رہی ہو یا —!"

اپنی تمنّاؤں پر پانی پھرتے دیکھ کر منگلم دُکھی ہو گئی۔ وسالم ان باتوں سے بالکل بےخبر تھی۔

صبح صبح دفتر میں فائلوں کو میز پر پٹک کر منگلم نے چاروں طرف دیکھا۔ ابھی بہت سے کلرک آئے نہیں تھے۔ اسی وقت چپراسی اُس کے پاس آیا۔

"کیا بات ہے، جے رام ؟"

"صاحب نے دریافت کیا ہے کہ آپ آگئی ہیں یا نہیں ؟"

"اگر آگئی ہوں تو ؟"

"انھوں نے آپ کو یاد کیا ہے۔"

"اچھا!"

منگلم بیزار ہو گئی تھی۔ اس کے باس نٹراجن کو مدراس آئے ابھی ایک ماہ بھی نہ ہوا تھا۔ آج تک نہ کسی افسر نے اتنے سویرے دفتر پہنچ کر نئی پرانی سبھی فائلیں باریکی سے دیکھی ہیں، نہ کسی نے کھوج کھوج کر اتنے سوالات ہی پوچھے ہیں لیکن نٹراجن بھی ہزاروں میں ایک ہے۔ دس سال پہلے جب وہ اس دفتر میں آئی تھی تب نٹراجن گزیٹیڈ افسر نہیں تھا۔ یہاں سے اس کا تبادلہ کوئمبٹور ہو گیا تھا پھر چار سال بعد ایک ضروری کام سے وہ دلّی بھیج دیا گیا۔ وہاں سے بھارت سرکار نے امریکی زراعتی فارم کے افتتاح کے لئے اسے بھی ایک وفد کا رکن بنا کر بھیجا تھا۔ ایک سال غیر ممالک میں رہ کر پھر وہ دلّی میں تین سال تک کام کرتا رہا اور اب پھر ترقی پا کر پہلی جگہ پر ایک افسر بن کر واپس آگیا تھا۔ اب اس کی تنخواہ آٹھ سو روپے ماہوار ہے۔ منگلم آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی نٹراجن کے کمرے میں داخل ہوئی اور مخاطب ہوئی۔ "گڈ مارننگ سر!"

"گڈ مارننگ مس منگلم، تشریف رکھئے۔"

"شکریہ سر!"

کچھ دیر تک وہ مختلف دفتری موضوعات پر باتیں کرتے رہے۔ باتوں کے دوران منگلم اُسے غور سے دیکھتی رہی۔ کاش! ماں اس کی بات مان لے تب تو وِسالم بہت ہی خوش قسمت ہوگی۔ نٹراجن بیرونی ممالک کا دورہ کر کے آیا ہے پھر بھی یہی اڑتیس ۳۸ سال ہو گی۔ امریکہ ہو کر آیا ہے پھر بھی سگریٹ نوشی جیسی عام لت بھی اُسے نہ پڑی تھی اور اس کی گفتگو کا انداز کتنا پیارا ہے لیکن، لیکن کیا وِسالم راضی ہو جائے گی ؟ ماں ٹھنے گی تو کیا کہے گی، اٹھارہ سال کا فرق! یہ سوچ کر ہی شاید وہ بے ہوش ہو جائے۔

"شکریہ مس منگلم!" ایک خط پر نظریں جمائے اچانک نٹراجن بولا۔

منگلم اس کا مطلب یہ سمجھی کہ اب وہ جا سکتی ہے اور وہ اُٹھ کر جانے لگی۔

"ذرا ٹھہریئے۔ اب میں دفتر کے متعلق کچھ نہیں کہہ رہا ہوں" نٹراجن فوراً بول اُٹھا۔

لمحہ بھر کے لئے منگلم کشمکش میں پڑ گئی۔

"جب آپ ٹائپسٹ مقرر ہوئی تھیں اس وقت میں بھی یہیں کام کر رہا تھا۔ یاد ہے آپ کو ؟"

"ہاں یاد ہے!" منگلم کے ڈُوبتے اعتماد کو سہارا ملا۔

"تب آپ کو یہ بھی یاد ہو گا کہ آپ نے ایک نوٹ میں "ناٹ" کے بدلے "نو" (NOW) ٹائپ کر دیا تھا،

جس کی وجہ سے "روپے مت دو" کا مفہوم بدل کر "روپے ابھی ادا کرو" ہو گیا تھا۔ میں نے جس وقت آپ کی توجہ کو اُس غلطی کی طرف مبذول کی تو آپ رو پڑی تھیں۔"

اُس منظر کا کتنا صحیح نقشہ کھینچا تھا نٹراجن نے۔

"ہاں اچھی طرح یاد ہے!" منگلم نے کہا۔

"اچھا ہوتا اگر میں نے کسی اچھے حادثہ کی یاد دلائی ہوتی۔" کہتے کہتے اچانک نٹراجن کی آواز اُتر گئی۔ وہ سوچنے لگا انجانے میں کہیں اُس نے منگلم کے دل کو چوٹ تو نہیں پہنچائی۔

"ہاں وہ سب یاد کرتی ہوں تو خود پہ ہنسی آجاتی ہے۔ دس سال!!"

"ہاں طویل دس سال——"

"اچھا تو مجھے اجازت دیجئے۔"

"ایک بات اور! آج میری بہن بنگلور سے آئی ہوئی ہے۔ گھر میں صرف وہ اُس کا مُنّا۔ دو لوگ ہی ہیں۔ صبح کو ہوٹل سے کھانا منگوا لیا تھا۔ شام کو تھوڑی دیر کے لئے اگر آپ میری بہن سے ملنے آئیں تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ مجھے ایک دعوت میں شرکت کرنی ہے۔ اگر آپ کو تکلیف محسوس ہو تو مجھے معاف کر دیں۔"

شاید خدا ہی نے ایک سُنہرا موقع عطا کیا ہے منگلم فرطِ مسرت سے بول اُٹھی "مجھے اُن سے مل کر بہت خوشی ہوگی سر!"

"تین بجے آپ کو کار سے وہاں چھوڑ دوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!"

پھر اُس دن منگلم کا دل کام میں ذرا بھی نہ لگا۔ آنکھوں کے سامنے دلہن بنی وسالم بیٹھی رہی۔

سوا تین بجے سے ساڑھے چھ بجے تک منگلم اور وملا کے درمیان نہ جانے کیا کیا باتیں ہوئیں۔ نٹراجن کی مصائب و آلام سے پُر زندگی——حصولِ علم کے لئے جھیلے ہوئے مصائب! پھر بہنوں کی شادی کے لئے پریشانی اور دوڑ دھوپ اور دوسرے حادثات کا رُندھے ہوئے گلے سے ذکر کرتے ہوئے وِملا نے اچانک اُس پر جیسے بم اُٹھا کر پھینک دیا—— اپنی کچی عمر اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے منگلم اُس غیر متوقع دھکّے کو برداشت نہ کر سکی تھی۔

"منگلم! تم انکار نہ کرنا۔ نٹراجن کہتا ہے تمہارے چہرے پر نسوانیت کی عظمت اور نور

تمھارے برتاؤ میں شائستگی اور خوش اخلاقی ہے۔ اُس کی طرح تم بھی اپنے خاندان کے لئے بہت کچھ کر چکی ہو۔ اتنے دنوں تک شادی کا نام لیتے ہی بھیا ناراض ہو جاتا تھا لیکن دو دن پہلے مجھے اُس کا خط ملا اور میں بنگلور سے بُلوائی گئی ہوں تمھیں یہ سب بتانے کے لئے۔"

منگلم کرسی میں دھنس سی گئی۔ اُس کا سر چکرانے لگا۔ تینتیس سال کی عمر کے بعد ازدواجی زندگی ——— سوکھی پتی پھر لہلہائے ——— وہ تو اب دھوپ میں سُکھائی ہوئی آم کی ایک قاش کی طرح ہے۔ اُس میں اب ذرا سی بھی تازگی باقی نہیں ——— بالکل خشک ——— اپنی تمناؤں کو کچل کر، اپنے مچلتے جذبات اور حسین تصورات کو دل ہی میں دفن کر کے کیلنڈر کے پرانے اوراق کی طرح وہ بیتے دنوں کو گننے والی ایک مشین ہے۔ اُس کی شادی ہو گی؟ اور شادی بھی نٹراجن جیسے بڑے افسر سے ———!! اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ ہنسے یا رو دے۔

"تم انکار نہ کرنا ———!" دِملا نے ملتجی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن میری عمر اب تینتیس سال کی ہو چکی ہے!"

"اور دس مہینوں میں میرا بھیا بھی چالیس پار کرے گا۔ جس نے ہم سب کو زندگی دی، کیا اُسے زندگی نہیں چاہئے؟" کہتے کہتے دِملا کی آواز حلق میں اٹک سی گئی۔

"لیکن میرا دل نہیں مانتا ——— میری اور بھی تین بہنیں ہیں۔ سب سے چھوٹی بی۔ اے پاس ہے۔ اُسے ———"

"ہے! ہم بھی تین ہزار لڑکیوں کو جانتے ہیں لیکن میرے بھیا کی نظروں میں صرف ایک ہی سمائی ہے، اور وہ تمہیں ہو ——— صرف تم ہی ———!!"

ساڑھے چھ بجے نٹراجن لوٹا۔ فوراً منگلم نے جانے کے لئے اجازت چاہی۔

"چلو، تمھیں گھر تک چھوڑ آؤں ———" نٹراجن نے اپنی خواہش ظاہر کی۔

"جی! اس کی کوئی ضرورت نہیں ——— میں ———"

"واہ! ضرورت کیوں نہیں ——— نونگم پاکم اور میلاپور ——— ان دو محلوں میں کتنی دوری ہے!"

منگلم چپ سی ہو گئی ——— کار میلاپور کی طرف چل پڑی ——— کیا بات کہے ———؟ منگلم یہ سوچ نہ سکی، لیکن نٹراجن خود بول اُٹھا ——— "مجھے معاف کر دو منگلم!"

"معاف کر دوں؟ کس لئے ———؟ لیکن میرے دل کے آسمان پر آرزو کی پتنگ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"میں بھی تمہاری ہی طرح زندگی کی تلخیوں کو پی کر زندگی کے کئی کٹھن مرحلوں سے گزر چکا ہوں مِس منگلم! بس ابھی ابھی اپنے آپ کو تھوڑا آزاد محسوس کرنے لگا ہوں —— اب تو تم بھی اپنی بہنوں سے وابستہ فرائض سے سبکدوش ہو چکی ہو نا ؟"

"ہاں! لیکن کم سے کم اپنی چھوٹی بہن کی سُونی زندگی کو آباد دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"تو تمھیں زندگی نہیں چاہیئے! ساتھ ہی دوسری دو بہنوں کی زندگی کا فیصلہ بھی تم خود کر چکی ہو، کیوں ؟ کیا اُن دونوں کو بھی ؟"

"مجھے برف کی سِل بنے تینتیس ۳۳ سال ہو چکے ہیں۔ اب بھی کیا مجھ میں ——"

"زندگی اور چڑھتی عمر کا باہم کوئی مختلف رشتہ نہیں ہے۔ ایک دن کی بہار بھی آخر زندگی ہی ہے۔"

منگلم کے دل میں طوفان اُٹھنے لگے۔ گھر پہنچنے تک وہ اپنے آپ ہی میں کھوئی رہی۔

دوسرے دن نٹراجن دفتر نہیں آیا۔ منگلم نے سوچا شاید بہن کے آجانے سے اُس نے چھٹی لے لی ہے۔ کسی کام میں اُس کا دل نہ لگا۔ اُس کے خیالات پر نٹراجن ہی چھایا ہی رہا۔

تین بجے وسالم دوڑتی ہوئی سیکشن میں چلی آئی۔

"دیدی! ماں نے تمھیں ابھی بلایا ہے! چلو، باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔"

باہر ایک بڑی ٹیکسی میں پنکجم اور ابھیم بیٹھی تھیں۔

اُسے دیکھتے ہی ان دونوں کی شوخ و شنگ آنکھوں میں مسکراہٹ کھیل گئی۔

گھر میں صرف ماں ہی نہیں تھی۔ وِملا کا مُنّا بھی دروازے پر کھیلتا ملا۔ اُسے دیکھتے ہی پچھلے دن کے تعارف کے باعث وہ مسکرا اُٹھا۔

"منگلم! پہلے اپنے پتاجی کی تصویر کو نمسکار کرو۔ آج ہمارے گھر میں پہلی بار ایک شمع جلنے والی ہے جس کا نُور ابد تک پھیلتا رہے گا۔"

چمکیلی آنکھوں کے ساتھ اُس نے ماں کو اور پتاجی کی تصویر کو نمسکار کیا۔

"تم میری شادی رچانا چاہتی تھیں نا —— ؟" وسالم کی شریر نگاہوں میں عجیب چمک تھی۔

"پنکجم!"

"کیا ہے ماں ؟"

"پان سپاری بدلتے ہی شادی پکی سمجھو ——— دلہا کو دو ناریل دو۔"

"اچھا ماں ——— دیدی ——— ! او دیدی ——— !! اُدھر دیکھو نا دیدی ——— !

تمھارے "وہ" آ رہے ہیں ——— !!!"

گھر ہنسی کی لہروں سے گونج اُٹھا۔

منگلم کی کنول جیسی پلکیں اُس کے گالوں پر جھک گئیں۔

اُس کے لبوں پر اس طرح تبسّم کی کلیاں چٹک پڑیں ———————————

——— ... جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے ... ———————

(ترجمہ:۔ یعقوب فاروقی)

وشمبھرناتھ کوشک



ماں! میں بھی راکھی باندھوں گی۔

ساون کی دھوم دھام ہے۔ شہری مرد اور عورتیں بڑے جوش وخروش سے اس تہوار کو منا رہے ہیں۔ بہنیں اپنے بھائیوں اور برہمن اپنے ججمانوں کے راکھیاں باندھ باندھ کر چاندی کر رہے ہیں۔ ایسے ہی موقعے پر ایک چھوٹے سے گھر میں دس برس کی ایک کمسن بچّی نے اپنی ماں سے کہا۔

"ماں! میں بھی راکھی باندھوں گی۔"

اس کے جواب میں اس کی ماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "کس کے باندھے گی بیٹی۔ آج تیرا بھائی ہوتا! تو ——"

ماں اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا گلا رندھ گیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔

کم سن بچّی نے اٹھلا کر کہا۔ "تو کیا بھیا کے ہی راکھی باندھی جاتی ہے اور کسی کے نہیں؟ بھیا نہیں ہے تو میں تمھارے ہی راکھی باندھوں گی۔"

اس دکھ کے وقت اس بچی کی بات سن کر اس کی ماں مسکرانے لگی اور بولی "اری تو اتنی بڑی ہو گئی —— بھلا کہیں ماں کے بھی راکھی باندھی جاتی ہے۔" بچی اداس ہو گئی۔

ماں گھر کا کام کرنے لگی۔ گھر کا کام ختم کر کے اس نے لڑکی سے کہا "آ تجھے نہلا دوں۔"

لڑکی نے سنجیدہ منھ بنا کر کہا "میں نہیں نہاؤں گی۔"

ماں۔ کیوں؟ نہائے گی کیوں نہیں؟"

لڑکی ۔ مجھے کیا کسی کے راکھی باندھنی ہے ؟

ماں ۔ ارے راکھی نہیں باندھنی ہے تو کیا نہائے گی بھی نہیں آج تہوار کا دن ہے چل اٹھ نہا۔

لڑکی ۔ راکھی نہیں باندھوں گی تو تہوار کاہے کا ؟

ماں ۔ (کچھ بگڑ کر) ارے کچھ پگلا گئی ہے۔ راکھی راکھی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بڑی راکھی باندھنے والی بنی ہے۔ ایسے ہی ہوتا تو آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔ پیدا ہوتے ہی باپ کو کھا بیٹھی۔ ڈھائی برس ہوتے ہوتے بھائی سے گھر چھڑا دیا۔ تیرے ہی کرموں سے سب ناس ہو گیا۔

بچی کے چہرے کا رنگ اتر گیا اور آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے چپ چاپ نہانے کو اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایک گھنٹے بعد ہم اسی بچی کو اس کے گھر کے دروازے پر کھڑی دیکھتے ہیں۔ اس وقت بھی اس کے مرجوم چہرے پر اداسی ہے اب بھی اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔

مگر لڑکی اس وقت دروازے پر کیوں ؟ معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی ضروری کام سے کھڑی ہے کیونکہ جب کوئی اس کے سامنے سے نکلتا ہے تب وہ بڑی بیتابی سے اس کو دیکھنے لگتی ہے جیسے وہ زبان سے کچھ کہے بغیر صرف اپنے اندرونی جذبہ کے اثر سے ہی اس شخص کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔ مگر جب اُسے اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو اُس کی اداسی بڑھ جاتی ہے۔

اسی طرح ایک دو تین کر کے نہ جانے کتنے لوگ بغیر اس کی طرف دیکھے نکل گئے۔ آخر کار مایوس ہو کر وہ بچی اب گھر کے اندر جانے کے لئے تیار ہی ہوئی تھی کہ ایک خوبصورت شخص کی نظر جو کچھ سوچتا ہوا دھیرے دھیرے جا رہا تھا، اس لڑکی پر پڑی۔ بچی کی آنکھیں اس نوجوان کی نظروں سے ملیں۔ نہ جانے ان اداس اور حیرت بھری نگاہوں میں کیا جادو تھا کہ وہ نوجوان ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا اور بڑے غور سے سر سے پیر تک دیکھنے لگا۔ غور سے دیکھنے پر نوجوان کو یہ احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہیں۔

وہ بے چین ہو اُٹھا۔ نزدیک جا کر اس سے پوچھا۔ "مُنّی کیوں روتی ہو؟"

لڑکی اس بات کا جواب نہ دے سکی۔ مگر اس نے اپنا ایک ہاتھ نوجوان کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے دیکھا لڑکی کے ہاتھ میں ایک لال دھاگہ ہے۔ اُس نے پوچھا یہ کیا ہے؟ لڑکی نے نظریں نیچی کر کے جواب دیا "راکھی"۔

نوجوان سمجھ گیا۔ اُس نے مسکرا کر اپنا داہنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

لڑکی کا کندن جیسا چہرہ کھل اُٹھا۔ اُس نے بڑے چاؤ سے اس نوجوان کے ہاتھ میں راکھی باندھ دی۔

راکھی بندھوا چکنے کے بعد نوجوان نے جیب میں خالی ہاتھ ڈالا اور دو روپے نکال کر لڑکی کو دینے لگا۔ مگر بچّی نے انھیں لینا قبول نہیں کیا۔ بولی "نہیں... پیسے دو۔"

نوجوان۔ یہ پیسے سے بھی اچھے ہیں۔

لڑکی۔ نہیں میں پیسے لوں گی یہ نہیں۔

نوجوان۔ لے لو منی۔ اس کے پیسے منگا لینا۔ بہت سے ملیں گے۔

لڑکی۔ نہیں۔ پیسے دو۔

نوجوان نے چار آنے پیسے دیتے ہوئے کہا۔ اچھا لے پیسے بھی لے اور یہ بھی لے۔

لڑکی۔ نہیں خالی پیسے لوں گی۔

"تجھے دونوں لینے پڑیں گے" یہ کہہ کر نوجوان نے زبردستی پیسے اور روپے لڑکی کے ہاتھ پر رکھ دیئے۔

اتنے میں گھر کے اندر سے کسی نے پکارا "ارے سرسوتی کہاں گئی؟"

لڑکی نے "آئی" کہہ کر نوجوان کی طرف شکر گزار نگاہوں سے دیکھا اور چلی گئی۔

۲

گولہ گنج لکھنؤ کی ایک بڑی خوبصورت عمارت کے ایک سجے ہوئے کمرے میں ایک نوجوان فکر میں ڈوبا بیٹھا ہے۔ کبھی وہ ٹھنڈی سانسیں بھرتا ہے، کبھی رومال سے آنکھ پونچھتا ہے۔ کبھی آپ ہی آپ کہتا ہے "ہائے ساری محنت بیکار گئی، ساری کوشش رائیگاں ہو گئی۔ کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ انھیں کہاں ڈھونڈوں۔ سارا اناؤ چھان مارا مگر پھر بھی پتہ نہ لگا ——" نوجوان آگے کچھ اور کہنے کو تھا کہ کمرے کا دروازہ دھیرے سے کھلا اور ایک

نوکر اندر آیا۔

نوجوان نے بے تکلفی سے پوچھا "کیوں کیا ہے؟"

نوکر۔ سرکار امرناتھ بابو آئے ہیں۔

نوجوان۔ (سنبھل کر) اچھا یہیں بھیج دو۔

نوکر کے چلے جانے پر نوجوان نے رومال سے آنکھیں پونچھ ڈالیں اور چہرے پر سنجیدگی لانے کی کوشش کرنے لگا۔

دروازہ پھر کھلا اور ایک نوجوان اندر آیا۔

نوجوان۔ آؤ بھائی امرناتھ۔

امرناتھ۔ کہو گھنشیام آج اکیلے کیسے بیٹھے ہو؟ کانپور سے کب لوٹے؟

گھنشیام۔ کل آیا تھا۔

امرناتھ۔ اناؤ بھی ضرور ہی اترے ہو گے؟

گھنشیام۔ ہاں اترا تھا مگر بیکار۔ وہاں اب میرا کیا رکھا ہے؟

امرناتھ۔ مگر کرو کیا۔ دل نہیں مانتا۔ کیوں؟ اور سچ پوچھو تو بات ہی ایسی ہے۔ اگر تمھاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا۔

گھنشیام۔ کیا کہوں دوست! میں تو ہار گیا۔ تم جانتے ہی ہو مجھے لکھنؤ آکر رہتے ہوئے ایک برس ہو گیا اور جب سے یہاں آیا ہوں انھیں ڈھونڈنے میں کچھ بھی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر سب بیکار۔

امرناتھ۔ انھوں نے اناؤ نہ جانے کیوں چھوڑ دیا اور کب چھوڑا۔ اس کا بھی کوئی پتہ نہیں چلتا۔

گھنشیام۔ اس کا تو پتہ چل گیا کہ وہ لوگ میرے چلے جانے کے ایک برس بعد اناؤ سے چلے گئے۔ مگر کہاں گئے یہ نہیں معلوم۔

امرناتھ۔ یہ کس سے معلوم ہوا؟

گھنشیام۔ اسی دکان والے سے جس کے مکان میں ہم لوگ رہتے تھے۔

امرناتھ۔ ہائے افسوس!

گھنشیام۔ کچھ نہیں سب میرے ہی اعمال کا نتیجہ ہے۔ اگر میں ان کو چھوڑ کر نہ جاتا، گیا بھی تھا تو ان کی خبر گیری کرتا رہتا۔ مگر میں تو دکھن جا کر روپیہ کمانے میں اتنا مشغول رہا کہ کبھی یاد ہی

نہ آئی اور جو آتی بھی تو صرف چند لمحوں کے لئے۔ اف! کوئی بھی اپنے گھر کو بھول جاتا ہے۔ میں ہی ایسا گنہگار ہوں۔

امرناتھ۔ (بات کاٹ کر) اجی نہیں سب وقت کی بات ہے۔

گھنشیام۔ میں دکھن نہ جاتا تو اچھا تھا۔

امرناتھ۔ تمہارا دکھن جانا تو بیکار نہیں گیا۔ اگر نہ جاتے تو اتنی دولت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

گھنشیام۔ اجی جہنم میں جائے دولت۔ ایسی دولت کس کام کی۔ میرے دل کو سکون نہیں تو دولت کس مرض کی دوا ہے؟

امرناتھ۔ ایں یہ ہاتھ میں لال ڈورا کیوں باندھا ہے؟

گھنشیام۔ اس کی تو بات ہی بھول گیا۔ یہ راکھی ہے۔

امرناتھ۔ بھائی واہ اچھی راکھی ہے۔ لال ڈورے کو راکھی بتاتے ہو۔ یہ کس نے باندھی ہے کسی بڑے کنجوس برہمن نے باندھی ہوگی۔ کمبخت نے ایک پیسہ خرچ کرنا گناہ سمجھا۔ ڈورے ہی سے کام چلا دیا۔

گھنشیام۔ دنیا کی قیمتی سے قیمتی راکھی سے بھی زیادہ یہ لال ڈورا مجھے عزیز ہے ۔ یہ کہہ کر گھنشیام نے اسے کھول کر بڑی احتیاط سے اپنے بکس میں رکھ لیا۔

امرناتھ۔ بھائی تم بھی عجیب آدمی ہو۔ آخر یہ ڈورا باندھا کس نے ہے؟

گھنشیام۔ ایک بچی نے۔

پڑھنے والے سمجھ گئے ہوں گے کہ گھنشیام کون ہے؟

امرناتھ۔ بچی نے کیسے باندھا اور کہاں؟

گھنشیام۔ کانپور میں۔

گھنشیام نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔

امرناتھ۔ اگر یہ بات ہے تو سچ مچ یہ ڈورا بیش قیمت ہے۔

گھنشیام۔ نہ جانے کیوں اس بچی کا دھیان میرے دل سے نہیں اترتا۔

امرناتھ۔ اس کی سادگی اور محبت نے تمہارے دل پر اثر ڈالا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟

گھنشیام۔ نام تو مجھے نہیں معلوم۔ اندر سے کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تھا مگر میں سُن نہ سکا۔

امرناتھ۔ اچھا خیر۔ اب تم نے کیا سوچا ہے؟

امرناتھ۔ صبر کر کے چپ چاپ بیٹھنے کے سوا اور میں کر ہی کیا سکتا ہوں؟ مجھ سے جو ہو سکا میں کر چکا۔

گھنشیام۔ ہاں یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔ بھگوان پر چھوڑ دو۔ دیکھو کیا ہوتا ہے؟

۳

اوپر کے واقعے کو پانچ برس گزر گئے۔ گھنشیام داس پچھلی باتیں تقریباً بھول گئے ہیں مگر اس لڑکی کی یاد کبھی آجاتی ہے۔ اُسے دیکھنے وہ ایک بار کانپور گئے بھی تھے۔ مگر اس کا پتہ نہ چلا۔ اس گھر میں پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ وہاں سے اپنی ماں کے ساتھ بہت دن ہوئے نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اُس کے بعد جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کا دھیان بھی کم ہوتا گیا۔ لیکن اب بھی جب وہ اپنا بکس کھولتے ہیں تب کوئی چیز دیکھ کر چونک پڑتے ہیں اور ساتھ ہی کوئی پرانا منظر بھی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

گھنشیام ابھی تک کنوارے ہیں۔ پہلے تو انھوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ شادی کریں گے ہی نہیں۔ مگر دوستوں کے کہنے اور خود اپنے تجربے کی بنا پر انھوں نے اپنی رائے بدل دی۔ اب وہ شادی کرنے پر تیار ہیں۔ مگر ابھی تک کوئی لڑکی پسند کے مطابق نہیں ملی۔

گرمی کا مہینہ ہے۔ دن بھر کی جلا دینے والی دھوپ کے بعد غروب آفتاب کا وقت بڑا پُرسکون معلوم ہو رہا ہے۔ اس وقت گھنشیام داس اپنی کوٹھی کے باغ میں دوستوں کے ساتھ بیٹھے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کا لطف اٹھا رہے ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق ہو رہا ہے۔ باتیں کرتے کرتے ایک دوست نے کہا۔ "اجی ابھی تک امرناتھ نہیں آئے۔

گھنشیام۔ وہ من موجی آدمی ہے۔ کہیں بیٹھ گیا ہوگا۔

دوسرا۔ نہیں وہ آج کل تمھارے لئے ایک دلہن کی فکر میں ڈوبا رہتا ہے۔

گھنشیام۔ دل لگی مت کرو۔

دوسرا۔ نہیں۔ دل لگی کی بات نہیں ہے۔

تیسرا۔ ہاں! پرسوں بھی وہ کہتا تھا کہ گھنشیام کی شادی ہو جائے تو مجھے اطمینان ہو۔

یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ امرناتھ لپکتے ہوئے آپہنچے۔

گھنشیام۔ یار بڑی عمر ہے۔ ابھی تمھاری ہی یاد ہو رہی تھی۔

امرناتھ۔ اس وقت بولئے نہیں ورنہ ایک آدھ کو مار بیٹھوں گا۔

دوسرا۔ جان پڑتا ہے کہ کہیں سے پٹ کر آئے ہو۔

امرناتھ۔ تو پھر بولا — کیوں؟

دوسرا۔ کیوں! بولنا کیا کسی کے ہاتھ بیچ کھایا ہے؟

امرناتھ۔ اچھا دل لگی چھوڑو۔ ایک ضروری بات ہے۔

سب ایک ساتھ بیتاب ہوکر بولے "کہو کہو کیا بات ہے؟"

امرناتھ۔ (گھنشیام سے) تمھارے لئے ایک دلہن ڈھونڈلی ہے۔

سب۔ (ایک ساتھ) "پھر کیا۔ تمھاری چاندی ہے"

امرناتھ۔ پھر وہی دل لگی۔ یار تم لوگ عجیب آدمی ہو۔

تیسرا۔ اچھا بتاؤ کہاں ڈھونڈی۔

امرناتھ۔ یہیں لکھنؤ میں۔

دوسرا۔ لڑکی کا باپ کیا کرتا ہے؟

امرناتھ۔ باپ تو مرچکا ہے۔

تیسرا۔ یہ بڑی بات ہے۔

امرناتھ۔ لڑکی ہے اور اس کی ماں۔ بس تیسرا کوئی نہیں۔ شادی میں کچھ ملے گا بھی نہیں۔ لڑکی کی ماں بہت غریب ہے۔

دوسرا۔ یہ اُس سے بھی بُری بات ہے۔

تیسرا۔ الو مر گئے پٹھے چھوڑ گئے۔ گھر بھی ڈھونڈا تو غریب۔ کہاں گھنشیام اتنا امیر کہاں سسرال اتنی غریب۔ لوگ کیا کہیں گے؟

امرناتھ۔ ارے بھائی کہنے اور نہ کہنے والے ہم ہی تم ہیں اور ان کا یہاں کون بیٹھا ہے جو کہے گا۔

گھنشیام نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

تیسرا۔ آپ نے کیا خوبی دیکھی جو اس رشتہ کے بارے میں سوچا ہے؟

امرناتھ۔ لڑکی کی بھلائی۔ لڑکی لکشمی کا روپ ہے۔ جتنی خوبصورت ہے اتنی ہی معصوم۔ ایسی لڑکی اگر چراغ لے کر ڈھونڈی جائے تو مشکل سے ملے گی۔

دوسرا۔ ہاں اگر ایسا ہے تو ایک بات ہوئی۔

امرناتھ۔ مگر لڑکی کی ماں لڑکا دیکھ کر شادی کرنے کو کہتی ہے۔

تیسرا۔ یہ تو قاعدے کی بات ہے۔

گھنشیام۔ میں بھی لڑکی دیکھ کر شادی کروں گا۔

دوسرا۔ یہ بھی ٹھیک ہی ہے۔

امرناتھ۔ تو اس کے لئے کیا سوچا ہے؟

تیسرا۔ سوچنا کیا؟ لڑکی دیکھیں گے۔

امرناتھ۔ تو کب؟

گھنشیام۔ کل۔

۴

دوسرے دن شام کو گھنشیام اور امرناتھ گاڑی پر سوار ہو کر لڑکی دیکھنے چلے۔ گاڑی چکر کھاتی ہوئی کیلی گنج کی ایک گلی میں جا کھڑی ہوئی۔ گاڑی سے اتر کر دونوں گلی میں گھس گئے تقریباً سو قدم چل کر امرناتھ ایک چھوٹے سے مکان کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

گھن شیام بولے "مکان سے تو بہت غریب جان پڑتے ہیں۔"

امرناتھ۔ ہاں بات تو ایسی ہی ہے۔ اگر لڑکی تمھیں پسند آجائے تو سب کچھ برداشت کیا جا سکتا ہے۔

اتنے میں دروازہ کھلا اور دونوں اندر گئے۔ شام ہو جانے کی وجہ سے مکان میں اندھیرا ہو گیا تھا۔ اس لئے وہ دونوں دروازہ کھولنے والے کو صاف طور پر نہ دیکھ سکے۔

ایک دالان میں پہنچ کر دونوں چارپائیوں پر بٹھا دیئے گئے اور بٹھانے والی جو عورت تھی کہا "میں ذرا دیا جلا لوں۔"

امرناتھ۔ ہاں جلا لو۔

عورت نے چراغ جلایا اور پاس ہی ایک دیوار پر اُسے رکھ دیا۔ پھر اُن کی طرف منہ کر کے نیچے چٹائی پر بیٹھ گئی۔ مگر جیسے ہی اس نے گھنشیام پر ایک نظر ڈالی۔ ایک دلسوز چیخ اس کے منہ سے نکلی اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔

عورت کی طرف کچھ اندھیرا تھا۔ اس لئے وہ دونوں اس کے چہرے کو غور سے نہ دیکھ سکے۔ گھنشیام اُسے اُٹھانے کے لئے بڑھے مگر جیوں ہی انھوں نے اس کا سر اٹھایا اور روشنی

اس کے چہرے پر پڑی وہ چلّا اٹھا۔ "میری ماں" اور وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔

امرناتھ بت بنے بیٹھے رہے اور چند لمحوں بعد بولے۔ بھگوان کی مرضی عجیب ہے۔ جنکے لئے تم در در کی ٹھوکر کھاتے رہے وہ اس طرح ملے۔

گھنشیام اپنے کو سنبھال کر بولے "تھوڑا پانی منگاؤ۔"

"کس سے منگاؤں؟ یہاں تو کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ مگر ہاں وہ لڑکی تمھاری" کہتے ہوئے امرناتھ رک گئے۔ پھر انھوں نے پکارا۔ "بٹیا! تھوڑا پانی دے جاؤ!" مگر کوئی جواب نہ ملا۔

امرناتھ نے پھر پکارا "بیٹی تمھاری ماں بے ہوش ہو گئی ہے تھوڑا پانی دے جاؤ۔"

اس لفظ 'بیہوش' میں نہ جانے کیا بات تھی کہ دوسری طرف برتن کھڑکنے کی آواز آئی۔ اس کے بعد ایک جوان لڑکی لوٹا لے کر آئی۔ لڑکی کچھ منھ ڈھکے ہوئے تھی۔ امرناتھ نے پانی لے کر گھنشیام کی ماں کا منھ اور چہرہ دھو دیا۔ تھوڑی دیر میں اُسے ہوش آگیا۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی پھر گھنشیام کو دیکھا۔ تب وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور بولی "کیا میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں؟ گھنشیام! کیا تو میرا کھویا ہوا گھنشیام ہے یا کوئی اور؟"

ماں نے لڑکے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے مگر یہ آنسو سکھ کے تھے یا دُکھ کے کون کہے؟

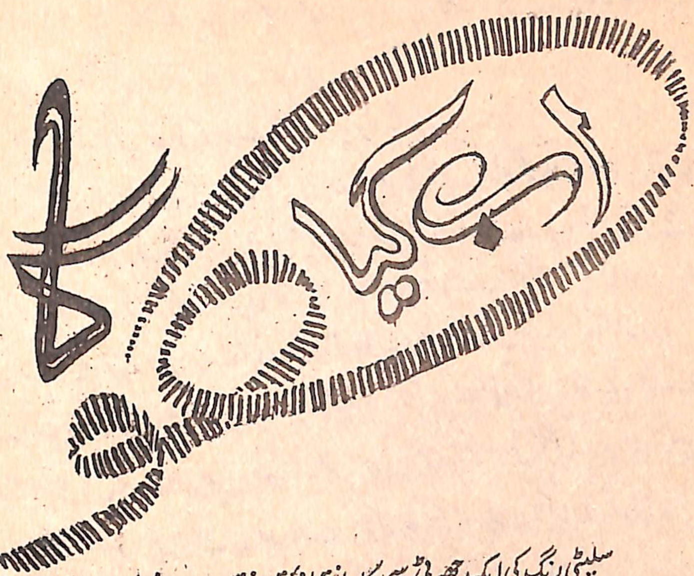
لڑکی نے یہ سب دیکھ سُن کر اپنا چہرہ کھول دیا اور بھیا بھیا کہتی ہوئی گھنشیام سے لپٹ گئی۔ گھنشیام نے دیکھا۔ لڑکی کوئی اور نہیں وہی ہے جس نے اسے راکھی باندھی تھی۔ پانچ سال پہلے اور جس کی یاد انھیں برابر آیا کرتی تھی۔

ساون کا مہینہ ہے اور تہوار کا موقع۔ گھنشیام داس کی کوٹھی خوبصورتی سے سجائی گئی ہے۔ گھنشیام اپنے کمرے میں بیٹھے ایک کتاب پڑھ رہے ہیں۔ اتنے میں ایک نوکرانی نے آکر کہا "بابو اندر چلو۔"

گھنشیام اندر گئے۔ ماں نے انھیں ایک آسن پر بٹھا دیا اور ان کی بہن سرسوتی نے انھیں تلک لگا کر راکھی باندھی۔

گھنشیام نے دو اشرفی اس کے ہاتھ میں رکھ دی اور مسکرا کر بولے "کیا پیسے بھی — دینے ہونگے؟"

سرسوتی نے ہنس کر کہا "نہیں بھیّا یہ پیسوں سے اچھی ہیں ان سے بہت سے پیسے آویں گے۔"



سلیٹی رنگ کی ایک چھوٹی سی کار انتہائی تیز رفتاری سے شہر کے بارونق بازاروں میں گزر رہی تھی۔ ڈرائیور کی سیٹ پر گہرے سرخ رنگ کی قمیص پہنے ایک شخص بیٹھا تھا جو چہرے بشرے سے عادی مجرم دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بائیں رخسار پر چاقو کے زخم کا نشان تھا، اس کا ایک کان ٹوٹا ہوا تھا اور ہونٹ سیاہی مائل تھے۔ غصے سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو مسلسل گالیاں دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیس یا بائیس سال کا ایک نوجوان بیٹھا تھا جو شکل و صورت سے معصوم نظر آتا تھا۔ وہ شہر کے اس چھٹے ہوئے بدمعاش، گرفن کا چھوٹا بھائی تھا اس کا نام ہینک تھا۔ ہینک اپنے بڑے بھائی گرفن سے بے حد خوف کھاتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ذاتی طور پر جرم سے نفرت کے باوجود چار سال پیشتر اسے ایک شخص کو قتل کرنے میں گرفن کی مدد کرنا پڑی۔ بدقسمتی سے دونوں بھائی موقع ہی پر گرفتار کر لیے گئے۔ مقدمہ چلا اور عدالت نے انھیں دس سال قید بامشقت کی سزا دے دی۔ پچھلے چار سال سے وہ پوسٹر کے تنگ و تاریک قید خانے سے فرار ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ آخر ایک روز موقع مل ہی گیا اور وہ پہرے دار کا گلا گھونٹنے کے بعد کوٹھری سے نکل بھاگے۔ اس کوٹھری میں ان کے ساتھ روبنش نامی ایک مجرم بھی تھا جو اِس صفائی سے پیٹ میں چھرا گھونپتا تھا کہ مقتول کے علاوہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی، وہ بھرے بازار میں اپنے دشمن کا پیٹ پھاڑنے کے بعد صاف بچ نکلتا تھا۔ فرار ہوتے وقت وہ بھی دونوں بھائیوں کے ساتھ تھا۔ بدرو میں

ہوتے ہوئے وہ تینوں قید خانے کی عمارت سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس وقت ساڑھے دس بجے تھے۔ گیارہ بجے تک قید خانے کے عملے کو ان کے فرار کی خبر نہیں ہوئی تھی کیونکہ اس سے پہلے ان کی کوٹھری میں کوئی نہیں آتا تھا۔ ان کے پاس صرف آدھ گھنٹہ تھا۔ قید خانے سے باہر نکلتے ہی گرفن کی نظر دیہاتی طرز کے ایک قلعہ نما مکان پر پڑی جس کے آنگن میں خشک گھاس کے بڑے بڑے گٹھر پڑے تھے۔ سامنے سڑک پر ایک جیپ آتی ہوئی دکھائی دی۔ انھوں نے ایک جست لگائی اور خشک گھاس میں جا چھپے۔ مکان سے باہر دُور دُور تک قید خانے کی زمین تھی جس میں قیدی کاشت کیا کرتے تھے۔ وہ خود بھی کئی مرتبہ یہاں آچکے تھے اور انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ قید خانے کی بیرونی چار دیواری پر پولیس کا ایک سپاہی بندوق لیے کھڑا رہتا ہے۔ ابھی وہ اسی ادھیڑ بن میں تھے کہ انھیں دو آدمیوں کی گفتگو سنائی دی۔ گرفن نے گھاس کے ایک پشتے میں سے سر نکال کر دیکھا۔ قید خانے کا سُرخ و سپید ڈاکٹر اپنے ڈرائیور سے باتیں کر رہا ہے۔ گیراج کے سامنے پہنچ کر وہ رُک گئے۔ اب اُن کی باتیں صاف سُنائی دے رہی تھیں۔

"مجھے ایک بجے میٹنگ میں جانا ہے، تم فوراً گاڑی لے جاؤ اور سکول سے بچوں کو لے آؤ۔"

"بہتر جناب!" ڈرائیور نے مہذب لہجے میں جواب دیا۔ ایک خیال بجلی کی طرح گرفن کے ذہن میں کوندا۔ "اگر کسی طرح یہ گاڑی مل سکے تو ـــ" اس نے جلدی سے اپنے ساتھیوں کو منصوبہ سمجھایا اور تینوں پنجوں کے بل چلتے ہوئے پھاٹک تک پہنچ گئے۔ کار سٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور ذرا سی دیر میں سلیٹی رنگ کی ایک چھوٹی سی خوبصورت گاڑی گیراج سے باہر نکلی۔ جونہی وہ پھاٹک پر پہنچی گرفن نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے ٹھہرا لیا۔ اگلے ہی لمحے روبش ڈرائیور کے سر پر تھا۔ اس سے پیشتر کہ غریب ڈرائیور کے مُنہ سے کوئی آواز نکلتی، روبش اس کا گلا دبانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سرکاری ڈاکٹر کی کار میں مزے سے بیٹھے تھے۔ گرفن ڈرائیور کی سیٹ پر تھا اور دھول سے اٹی ہوئی کچی سڑک پر انتہائی تیز رفتاری سے کار چلا رہا تھا۔ بیرونی پھاٹک سے گزرتے ہوئے اس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔ اس طرح پہرے دار کار میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی شکل نہ دیکھ سکے۔ ویسے بھی ڈاکٹر کی کار دیکھ کر وہ ایک طرف ہٹ گئے تھے۔ ابھی وہ بڑی سڑک پر نہیں پہنچے تھے کہ انھیں پیچھے سے سیٹیاں سُنائی دیں۔ ہینک نے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو ایک جیپ میں سپاہیوں کا ایک دستہ ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ خوف سے اُس کی رگوں میں خون جم کر رہ گیا۔ اس نے چلا کر گرفن سے کہا۔

"پولیس ہمارا پیچھا کر رہی ہے جلدی چلو۔"

"اب صرف ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ......"

گرفن نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر انتہائی پھرتی سے کار سڑک سے ہٹا کر ایک تنگ سی گلی میں ڈال دی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

قید خانے سے ان کے فرار کی خبر ہر جگہ پہنچ چکی تھی۔ پولیس سٹیشن میں انسپکٹر، جیسی دیپ، فون پر شہر سے باہر نکلنے والے تمام راستوں کی ناکہ بندی کا حکم دے چکا تھا اور اب قید خانے کے ناظم سے تینوں قیدیوں کی تصویریں طلب کر رہا تھا تاکہ شام کے اخبارات میں شائع کرائی جا سکیں۔ ٹریفک پولیس کے عملے کو کار کا رنگ اور نمبر بتلایا جا چکا تھا۔ اس کے علاوہ پولیس کی پانچ گاڑیاں شہر کے مختلف علاقوں میں سلیٹی رنگ کی کار کو تلاش کر رہی تھیں۔ شہر کے تمام ہوٹلوں کو خبردار کر دیا گیا تھا: اگر اس حلیے کے تین آدمی ان کے پاس آئیں، تو وہ قریبی پولیس اسٹیشن کو فوراً خبردار کر دیں۔ جیسی کا خیال تھا کہ وہ جلد سے جلد کار سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور اس مقصد کے لیے وہ کسی ویران سی جگہ کا انتخاب کریں گے۔ اس نے پولیس کی تمام چوکیوں میں فون کر دیا تھا کہ اپنے اپنے علاقے میں جتنے زیادہ سے زیادہ سپاہی ممکن ہوں سرکاری ڈاکٹر کی کار کی تلاش میں بھیج دیے جائیں۔ ان سب انتظامات سے مطمئن ہو کر وہ کرسی پر بیٹھا مزے سے پائپ پی رہا تھا اور ہر بار فون کی گھنٹی بجتی، تو وہ قیدیوں کے پکڑے جانے کی خبر سننے کے لیے فوراً ریسیور اٹھاتا۔ وہ اپنے انتظامات سے بہت خوش تھا اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تین مجرم اس کے لیے دردِ سر کا باعث بن جائیں گے۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂ ⁂

ہلرڈ ہاؤس میں اس وقت دوپہر کا کھانا پک رہا تھا۔ مسز ایلن ہلرڈ باورچی خانے میں تھی۔ اس کا دس سالہ بچہ رالف چولھے کے پاس بیٹھا اپنی ماں کے چہرے کی طرف ٹکر ٹکر دیکھے چلا جا رہا تھا۔ رالف کے بال سنہرے اور گھنگھریالے تھے اور آنکھیں بھوری۔ اس نے سفید رنگ کی نیکر پر سیاہ قمیص پہن رکھی تھی جس میں سے اس کا سفید رنگ خوب سج رہا تھا۔ عام حالات میں وہ بیحد شرارتی لڑکا تھا اور کبھی نچلا نہیں بیٹھتا تھا۔ لیکن اس وقت اسے سخت بھوک لگ رہی تھی اور وہ بڑی بے چینی سے کھانا پکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ مسٹر ہلرڈ حسبِ معمول ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے، وہ پانچ بجے کے قریب گھر پہنچتے تھے۔ ان کے گھر میں کوئی ملازم نہیں تھا۔ رالف کے علاوہ ان کی ایک سترہ سالہ بچی سین بھی تھی جو ایک فرم میں ٹائپسٹ تھی، وہ بھی پانچ بجے کے بعد ہی گھر آیا کرتی تھی۔ مسٹر ہلرڈ گاف روڈ پر ایک سٹور چلاتے تھے۔ اچھا کھاتا پیتا گھرانہ تھا۔ باپ، بیٹی دونوں کے پاس اپنی اپنی گاڑی تھی۔ ہلرڈ گھرانے کی ایک نمایاں

خصوصیت اس کے افراد میں بے انتہا محبت تھی۔ سب لوگ ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔
کسی شام ہلرڈ کو ذرا سی دیر ہو جاتی، تو سارا گھر اس کے انتظار میں کھانا نہیں کھاتا تھا۔

جس دوپہر کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ خاصی سرد تھی۔ باہر دھند پھیلی ہوئی تھی۔ بارہ بج کر چند منٹ پر ایلین کو باہر کسی کار کے رُکنے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت ہلرڈ یا سین کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس نے کھڑکی کھول کر دیکھا، تو ایک سلیٹی رنگ کی کار گیراج میں داخل ہو رہی تھی۔ یہ کون ہو سکتا ہے، مسز ہلرڈ نے سوچا۔ اگر یہ کوئی مہمان ہوتا تو کار کو گیراج میں بند کرنے کی کیا ضرورت تھی، لیکن اسے سوچنے کا زیادہ موقع نہیں ملا۔ باہر دروازے پر کوئی زور زور سے گھنٹی بجا رہا تھا۔ رالف دروازے کی طرف بھاگا۔ ایلین صرف اس خیال سے اس کے پیچھے چل دی کہ وہ مہمانوں کو پہچان نہ سکے۔ رالف نے دروازہ کھولا، تو اس کے سامنے کٹے ہوئے رخسار والا ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔

"فرمائیے۔" رالف نے بڑے بھولے پن سے پوچھا۔

لمبے آدمی نے اُسے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور خود لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ڈرائنگ روم کے وسط میں پہنچ کر رُک گیا۔

"دیکھیے ہلرڈ گھر میں موجود نہیں ہیں، آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" ایلین نے نووارد سے پوچھا۔

"جہنم سے، اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی، تو میں اسے گولی مار دوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے پستول کا رُخ رالف کی طرف پھیر دیا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور دو آدمی اندر گھس آئے۔ دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا۔

"مسز، آپ اپنا کام کیجیے۔ یہ بچہ ہمارے پاس موجود رہے گا۔ اگر آپ نے گھر کے کسی فرد کو خبردار کرنے کی کوشش کی، تو ہم اسے ختم کر دیں گے۔"

"گھر میں اس وقت کوئی موجود نہیں ہے۔" ایلین نے خوفزدہ ہو کر کہا۔

"ٹھیک ہے، آپ جا سکتی ہیں۔"

ایلین خاموش کھڑی رہی۔ لمبے آدمی نے باقی دونوں کو سارے گھر کی تلاشی لینے کے لیے اوپر بھیج دیا۔ ذرا سی دیر میں وہ ہلرڈ کی شکاری بندوق اور پستول لے کر دوبارہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ لمبے آدمی نے ہلرڈ کا پستول پکڑتے ہوئے اپنا پستول زمین پر گرا دیا اور زور سے قہقہہ

لگاتے ہوئے بولا :

"اس نقلی پستول نے خوب کام دیا - خیر اب تو ہمیں اصلی پستول مل گیا ہے۔"

ایلن ابھی تک دروازے میں کھڑی حیرت سے ان اجنبیوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو دن دھاڑے اس کے گھر میں گھس آئے تھے - لمبے آدمی نے اس کی طرف دیکھا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا :-

"ہینک، تم بندوق لے کر اوپر منزل میں چلے جاؤ اور جوہی کوئی شخص مکان میں داخل ہو ہمیں اطلاع دے دو - روبش تم باورچی خانے سے چاقو لے لو اور سیڑھیوں میں بیٹھ جاؤ - اگر تمھاری ضرورت پڑی، تو میں سیٹی بجا دوں گا۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور خوف زدہ ایلن سے مخاطب ہوا :-

"آپ کھانا لاسکتی ہیں؟"

"جی، جی ہاں!"

"ٹھیک ہے آپ ہمیں کھانا کھلا دیجیے۔"

"لیکن یہ سب کیا ہے، آپ چوروں کی طرح میرے گھر میں کیوں گھس آئے ہیں؟ آخر آپ چاہتے ...."

ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر پڑا اور وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑی -

"بکواس بند کرو اور جس طرح ہم کہتے ہیں اس طرح کرو، ورنہ پچھتاؤ گی - اطمینان رکھو، ہم مال و دولت کے بھوکے نہیں ہیں - ہمیں ایک رات آرام کرنے کے لیے بستر چاہئیں - صبح ہوتے ہی ہم رخصت ہو جائیں گے - اگر تم نے شور مچانے کی کوشش کی، تو اپنے بچے سے ہاتھ دھو بیٹھو گی، لیکن اگر تم نے خلوص دل سے ہماری خدمت کی، تو ہم تمھیں ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے۔"

ایلن چھوٹے چھوٹے متفکر قدم اٹھاتے ہوئے اوپر چلی گئی - تھوڑی دیر بعد تینوں مفرور قیدی کھانا کھا رہے تھے اور ننھا رالف سیڑھیوں میں بیٹھا ہوا حیرانی سے ان اجنبیوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو اپنے آپ کو اس گھر کا مالک سمجھ رہے تھے - کھانے سے فارغ ہو کر گرفن نے ایلن سے سین اور ہلرڈ کے بارے میں چند سوالات کیے اور پھر خاموشی سے صوفے پر دراز ہو گیا -

شام کو پانچ بجے سین کی نیلے رنگ کی چھوٹی سی کار پھاٹک میں سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی - سب سے پہلے روبش نے اس کی آمد کی اطلاع دی - گرفن نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سترہ اٹھارہ سال کی ایک خوش شکل لڑکی کمرے میں داخل ہوئی۔

مسنر ہلرڈ سین کو ایک طرف لے جاؤ اور سب کچھ سمجھا دو۔"

ایلین نے حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہوئے لڑکی کا بازو پکڑا اور ساتھ والے کمرے میں لے گئی۔

اچانک چھت سے روبش کی آواز سنائی دی:

"گرفن خبردار ہو جاؤ، شاید مالک مکان آ رہا ہے۔"

گرفن نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔ ایک لمبی سی کار مکان میں داخل ہو رہی تھی اور ۳۵، ۳۶ برس کا ایک خوش پوش مرد دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ گرفن نے سانس روک لی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ پکے فرش پر ہلرڈ کے فوجی بوٹوں کی آواز سنائی دی اور اگلے ہی لمحے دروازے کے دونوں پٹ کھل گئے۔ کھلے دروازے میں مکان کا مالک ڈان ہلرڈ کھڑا آنکھیں جھپکا رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کی نظر ایلین پر پڑی جس کا چہرہ خوف سے زرد ہو رہا تھا، پھر اس نے سین کو دیکھا جو تپائی پر دیوار کی طرف منہ کیے چپ سادھے بیٹھی تھی۔ ان دونوں سے ہٹ کر اسے کالا کلوٹا اور خوفناک مونچھوں والا گرفن دکھائی دیا جو پستول کا رخ اس کے سینے کی طرف کیے مسکرا رہا تھا۔ سیڑھیوں پر ایک اور نوجوان بندوق لیے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے ہلرڈ کی سوچنے سمجھنے کی طاقت جواب دے گئی۔ یہ سب کیا ہے، اس کا ذہن کام نہیں کر رہا تھا۔ اور پھر اچانک ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ شام کے اخبار میں جیل سے بھاگے ہوئے تین قیدیوں کی تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرا گئیں۔ اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور پھر بڑی متانت سے بولا:

مسٹر گرفن، میں نے تمھیں پہچان لیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم پستول رکھ دو، ورنہ ......"

اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ کر قریبی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیئے۔ نیچے پڑوسن کا مکان نظر آ رہا تھا۔ مسز والٹن صحن میں دانہ چگتی ہوئی مرغیوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کا سات سالہ بچہ ہنری لکڑی کے گھوڑے پر سواری کر رہا تھا، قریب ہی مسٹر والٹر دھوپ میں کرسی ڈالے شام کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

" انھیں بلانا زیادہ مشکل نہیں!"

گرفن نے آگے بڑھ کر پستول کی نالی سین کی کنپٹی پر رکھ دی اور غراتے ہوئے بولا۔

"بڑے شوق سے بلائیے، لیکن یاد رکھیے کہ ان کے آنے سے پہلے آپ کی لاڈلی کا جسم فرش پر تڑپ رہا ہو گا۔"

ایلن نے ایک جھرجھری لی اور بے تاب ہوکر ہلرڈ کی طرف دوڑی :

"خدا کے لیے ہلرڈ، ایسی حماقت نہ کرنا، ورنہ یہ ظالم میری بچی کو مار ڈالیں گے"!

ہلرڈ کی پیشانی پسینے سے تر ہو گئی۔ اُس نے بڑی آہستگی سے کھڑکی بند کر دی اور دھم سے صوفے پر گر پڑا۔

"آخر تم چاہتے کیا ہو"؟

"ہم صرف ایک رات گزارنا چاہتے ہیں"۔

"کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ صبح ہوتے ہی یہاں سے چل دوگے"؟

"ہاں، ہم وعدہ کرتے ہیں کہ رقم ملتے ہی یہاں سے رخصت ہو جائیں گے"۔

"کون سی رقم"؟

"ابھی بتلاتا ہوں، تمھارے ہاں فون ہے"؟

تھوڑی دیر بعد گرفن ڈائرکٹری پر جھکا ہوا تھا اور ہلرڈ خاموشی سے پاس بیٹھا تھا۔ آخر گرفن مطلوبہ فون نمبر تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"لو بھائی صاحب، یہ رہا فون نمبر اب تم فون آکیری میں اس نمبر پر ایک ٹرنک کال بک کروا دو۔ ابھی سارا معاملہ طے ہو جاتا ہے"۔

"تم خود یہ کام کیوں نہیں کرتے"؟

"زیادہ باتیں مت بناؤ، ورنہ ہم سختی کرنے پر مجبور رہوں گے"۔ یہ کہہ کر گرفن نے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ہینک کو آواز دی۔

"ہینک ذرا یہاں اس چھوکرے کو لے آؤ"!

ذرا سی دیر میں ہینک ننھے رالف کا بازو پکڑے کمرے میں آ دھمکا۔ ہلرڈ نے اسے چھڑانے کی کوشش کی، لیکن گرفن نے ایک جست لگا کر اسے دبوچ لیا۔ ہینک رالف کا بازو مروڑنے لگا۔ ننھا رالف درد کے مارے بُری طرح چیخ رہا تھا۔

"میں فون کرنے کے لیے تیار ہوں، تم رالف کو چھوڑ دو"۔ ہینک نے رالف کو باہر ڈھکیل دیا۔ ہلرڈ نے اپنے نام پر گرفن کے بتائے ہوئے نمبر پر آکیری میں ٹرنک کال بک کرائی اور رسیور گرفن کے حوالے کر دیا۔

سات بجے کے قریب انھوں نے کھانا کھایا اور اپنے اپنے بستر میں دبک گئے۔ گرفن پستول

ہاتھ میں لے کر ڈرائنگ روم کے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ روبش اور ہینک فرش پر کمبل لے کر لیٹ گئے۔
ہلرڈ دوسری منزل پر اپنے پلنگ پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ ساتھ والے پلنگ پر ایلین تکیے میں مُنہ چھپائے
آنسو بہا رہی تھی۔

"ہائے میرا رالف، کیا بنے گا اس کا؟"

"اطمینان رکھو ایلین، وہ اسے ماریں گے نہیں، وہ جانتے ہیں کہ اسے مارنے سے کوئی فائدہ نہیں۔
انھوں نے رالف کو اپنے پاس صرف اس خاطر رکھا ہے کہ ہم پولیس کو اطلاع نہ کر سکیں۔"

"انھوں نے ٹیلی فون والے کمرے کو بند کر کے تالا لگا دیا اور چابی اپنے پاس رکھ لی ہے۔"

"کوئی بات نہیں ایلین، تم اتنی متفکر کیوں ہو۔ صبح ان کی رقم یہاں پہنچ جائے گی اور وہ
یہاں سے چل دیں گے۔"

لیکن ایلین مطمئن نہیں تھی۔ اس کا دس سالہ بچہ رالف نیچے ڈرائنگ روم میں سو رہا تھا
جہاں تینوں بدمعاش آپس میں کھُسر پھُسر کر رہے تھے۔

اچانک اُسے سین کی چیخ سُنائی دی اور وہ ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھ بیٹھی۔ ذرا سی دیر میں
وہ ہلرڈ کے ساتھ سین کی خواب گاہ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ خواب گاہ میں روبش، سین کے ساتھ
گُتھم گُتھا ہو رہا تھا۔ ہلرڈ نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر جست لگائی اور روبش کو فرش پر گرا دیا۔ کچھ دیر تک
وہ ایک دوسرے سے زور آزمائی کرتے رہے۔ ہلرڈ کی جسمانی حالت بہت اچھی تھی، لیکن روبش جیسے
پیشہ ور بدمعاش سے لڑنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ روبش کے سامنے
چاروں شانے چت فرش پر پڑا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے روبش کو جیب سے تیز دھار کا ایک چاقو نکالتے
دیکھا۔ اس نے اُٹھنے کی کوشش کی لیکن پیٹ میں لگے ہوئے گھونسے کی وجہ سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔
روبش کا چاقو والا ہاتھ فضا میں بلند ہوا، ہلرڈ نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایلین نے اس منظر کو دیکھا اور
چکرا کر فرش پر گر پڑی۔ اس اثنا میں سین کے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ اس نے لکڑی کی تپائی اٹھا کر
پوری قوت سے روبش کے سر پر دے ماری۔ روبش کے مُنہ سے کراہنے کی آواز نکلی۔ اس نے چاقو کا رُخ
سین کی طرف پھیر دیا اور آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا مُنہ غصّے سے لال بھبھوکا ہو رہا
تھا۔ یوں محسوس ہوتا جیسے وہ سین کو قتل کر کے دم لے گا۔ مارے خوف سے سین کا جسم سُن ہو رہا تھا۔
وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ عین اس وقت دروازہ کھُلا اور گرفن ہاتھ میں پستول لیے اندر آیا۔

"دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو، ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

روبش نے چاقو زمین پر پھینک دیا اور دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیے۔

"میں نے تمھیں اس لیے اوپر نہیں بھیجا تھا کہ تم عورتوں پر ہاتھ اٹھانے لگو۔" گرفن غرایا۔

"تمھیں میرے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔"

"بکواس بند کرو اور سیدھی طرح نیچے چلو، تمھاری بے احتیاطی سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ سکتا ہے۔ یہ مت بھولو کہ تمھاری سختی سے تنگ آکر یہ لوگ تمھیں گرفتار کروانے پر تل جائیں گے خواہ ان میں سے ایک آدھ کو مرنا ہی کیوں نہ پڑے۔"

روبش پیر پٹختا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ گرفن نے کونے میں رکھی ہوئی ٹنکی سے پانی لے کر ہلرڈ اور امین کے منہ پر چھڑکا، ذرا سی دیر میں وہ دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں بہت شرمندہ ہوں۔" گرفن نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

"مسٹر گرفن میں سب کچھ برداشت کرسکتا ہوں، لیکن میری عزت پر حملہ کرکے تم لوگ کچھ عقلمندی کا ثبوت نہیں دے رہے۔ اس قسم کی بدتمیزی دوبارہ ہوئی، تو میں ہر قیمت پر پولیس کو اطلاع کردوں گا خواہ مجھے اپنی جان سے ہاتھ کیوں نہ دھونے پڑیں۔"

"مسٹر ہلرڈ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ اس قسم کی کوئی حرکت نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے، آپ لوگ صبح تک نیچے ڈرائنگ روم میں رہ سکتے ہیں، لیکن اگر آپ کی طرف سے دوبارہ کوئی شرارت ہوئی، تو یہ ہم دونوں کے لیے بہتر نہ ہوگا۔"

رات سرد اور نم آلود تھی۔ یخ بستہ ہوا کھڑکیوں سے ٹکراتی، تو یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی سیٹیاں بجا رہا ہے۔ ہلرڈ ہاؤس کی باہر کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں اور روشن دان مضبوطی سے بند کردیے گئے تھے اور ان پر گہرے نیلے رنگ کے پردے لٹک رہے تھے۔ سات بجے کے قریب ایک ٹرک بیرونی پھاٹک کے سامنے پہنچ کر رک گیا۔ پینتالیس سالہ ہنس مکھ جان ماسٹر دروازہ باہر کھول کر کودا اور دودھ کی بوتل پھاٹک کے اندر لڑھکاتے ہوئے ڈرائیور سے بولا۔

"یار ہماری بھی کوئی زندگی ہے، کتنا جاڑا پڑ رہا ہے اور ہم کتوں کی طرح مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ادھر دیکھو تو میرا یار ہلرڈ کیا مزے سے سو رہا ہے۔ ہاہا، کیا مزے کا آدمی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے اونگھتے ہوئے ڈرائیور پر ایک نظر ڈالی اور پھر خفا ہوکر بولا۔

"اماں۔ سو گئے کیا، عجیب افیمی سے پالا پڑا ہے۔"

اس درمیان میں ہلرڈ ہاؤس کے کونے کونے میں زندگی پیدا ہو چکی تھی۔ گرفن، ہینک اور

روبنسن اپنی اپنی جگہ مستعد تھے۔ ایلن پھٹی پھٹی آنکھوں سے انھیں دیکھے چلی جارہی تھی۔ آخر ہلرڈ نے مہر سکوت توڑ دی اور دھیرے سے بولا۔

"جان دودھ والا ہے، فکر نہ کرو، وہ اندر نہیں آئے گا۔"

"عین ممکن ہے، وہ بل وصول کرنے اندر چلا آئے۔" ایلن نے فوراً جواب دیا۔

"کچھ بھی ہو، ہم اسے سنبھال لیں گے۔" گرفن نے غراتے ہوئے کہا۔ لیکن ان کا یہ خوف جلدی دور ہوگیا۔ ٹرک کے بھاری انجن کے دوبارہ اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور پھر رات کے بیکراں سکوت میں گم ہوگئی۔ عین اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ وہ سب خاموشی سے اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ گھنٹی دوبارہ بجی اور دیر تک بجتی رہی۔ آخر سین نے ریسور اٹھالیا۔

"کون، چک رائٹ، ہاں میں سین بول رہی ہوں۔ نہیں اس وقت نہیں۔ ہاں میری طبیعت ذرا خراب ہے۔ نہیں نہیں تمھارے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے ایک نظر ہلرڈ کی طرف دیکھا۔ "ڈاکٹر، ہاں میں ڈاکٹر سے دوا لے چکی ہوں، اس نے کہا ہے اب میں آرام کروں ۔۔۔ نہیں، تم ہرگز نہ آنا، تمھارے آنے سے پہلے میں سو چکی ہوں گی۔ مجھے سخت نیند آرہی ہے۔ صبح ملیں گے۔ خدا حافظ!" یہ کہہ کر اس نے کھٹ سے فون بند کر دیا۔

"شاباش لڑکی، تم نے بڑی خوبی سے اپنا رول ادا کیا ہے، میں تم سے بہت خوش ہوں، کس کا فون تھا؟" گرفن نے اپنے بھدے اور پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے پوچھا۔

سین خاموش رہی، صرف اس کے کانوں کی لویں سرخ ہوگئیں۔

"یہ چک رائٹ تھا، سین کا منگیتر۔"

"اچھا اچھا۔"

اچانک رالف نیند سے ہڑبڑا کر اٹھا اور زور زور سے رونے لگا۔ ایلن نے جلدی سے اسے گود میں اٹھالیا اور چمکارتے ہوئے بولی: "کیا ہوا رالفی؟"

رالف کچھ جواب دینے کے بجائے اور زور شور سے رونے اور چیخنے لگا۔ ایلن نے اس کا ہاتھ پکڑ اور اسے کھینچتی ہوئی اوپر لے گئی۔

"مسٹر ہلرڈ، آپ ذرا اس بچے کو خاموش رہنے کی نصیحت کریں۔ اگر اس کی وجہ سے ہمارا کام بگڑ گیا، تو۔"

ہلرڈ کچھ کہے بغیر اپنی جگہ سے اٹھا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا رالف کے کمرے میں چلا گیا۔

رالف ابھی تک پوری قوت سے چیخ رہا تھا اور ایلین دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ بند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہرڈ کو دیکھتے ہی رالف خاموش ہو گیا اور بڑی رازداری سے بولا۔

"کیوں اپی کیسی رہی؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی کہ میں اس وقت تک چیختا رہوں گا جب تک اڑوس پڑوس کے سب لوگ یہاں پہنچ جاتے اور جب بہت سے لوگ یہاں آجائیں گے تو وہ ان بدمعاشوں کو ہمارے گھر سے مار بھگائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"بکواس بند کرو رالف، کیا تم چاہتے ہو کہ تمھاری بہن تمھاری آنکھوں کے سامنے گولیوں سے بھون دی جائے۔ کیا تم پسند کرتے ہو کہ وہ لمبا تڑنگا آدمی تمھاری امی کے پیٹ میں چاقو گھونپ دے۔ اگر تم یہ سب کچھ چاہتے ہو، تو ٹھیک ہے جو جی میں آئے کرو، لیکن یہ یاد رکھو کہ وہ لوگ جو اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، سات آدمیوں کو قتل کر چکے ہیں۔ ان کے لیے کسی شخص کو قتل کرنا ایسا ہی ہے جیسے تمھارے لیے تتلی کے پر مروڑ دینا۔

رالف سسکیاں بھرتے ہوئے اس کی گود میں آگرا۔ ہرڈ نے اسے اپنے ساتھ چمٹا لیا اور تھپکیاں دے کر سلانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد رالف گہری نیند سو گیا۔ ہرڈ نے آہستگی سے اسے بستر پر لٹا دیا اور ایلین کو اس کے پاس چھوڑ کر خود نیچے چلا گیا۔

دیوار پر لگے ہوئے کلاک نے نو بجائے تو گرفن کرسی پر اونگھ رہا تھا۔ ہرڈ اس وقت اپنی سرخ کار اُڑائے لیے چلا جا رہا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوا تھا۔ لمبی تاریک سڑک پر دونوں جانب اونچے لمبے سرنکانے کھڑے تھے۔ سردی کی وجہ سے سڑک سنسان پڑی تھی، ورنہ عام طور پر لوگ اس وقت چہل قدمی کے لیے نکلتے تھے، مگر اس گارڈن سے اس نے کار بائیں طرف موڑ لی۔ سامنے پولیس سٹیشن نظر آرہا تھا۔ آہنی پھاٹک کے قریب پہنچ کر اس نے کار روک لی۔ کھلے دروازے میں انسپکٹر جیسی دیپ نظر آرہا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے کار کا دروازہ کھولا اور تقریباً بھاگتا ہوا پولیس اسٹیشن کی چاردیواری میں داخل ہو گیا۔ تیزی میں اسے دائیں طرف سے آتا ہوا ایک سپاہی دکھائی نہ دے سکا اور وہ اس سے ٹکرا گیا۔

"معاف کیجئے گا۔ سپاہی نے زمین پر سے اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں غلطی میری ہی تھی۔" ہرڈ نے بڑی عاجزی سے کہا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا

انسپکٹر کے کمرے میں داخل ہوگیا۔ انسپکٹر جیسی دیپ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔ وہ اس خوش شکل اور خوش پوش دکاندار سے پہلے بھی کئی بار مل چکا تھا اور اس کے اخلاق سے بے حد متاثر تھا۔

"فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں مسٹر...... معاف کیجئے میں آپ کا نام بھول گیا۔"

"ہلرڈ، ڈان ہلرڈ۔"

"تشریف رکھیے۔"

ہلرڈ کرسی پر بیٹھ گیا اور شدت جذبات سے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں کھولنے اور بند کرنے لگا۔ اچانک اس کی نظر میز پر رکھی ہوئی ایک تصویر پر جا پڑی۔ یہ تصویر آٹھ نو سال کے ایک معصوم صورت بچے کی تھی جسے گلا گھونٹ کر مار دیا گیا تھا۔

"انسپکٹر صاحب، یہ تصویر کس کی ہے؟"

"کیا بتاؤں مسٹر ہلرڈ، یہ مارٹن جوزف نامی وکیل کے بیٹے کی تصویر ہے، کس بے دردی سے مارا ہے بے چارے کو۔"

"کس نے مارا ہے اسے؟"

"گذشتہ ہفتے کی بات ہے، ان کے ہاں چور آ گھسے۔ مسٹر مارٹن نے ہمیں فون کرنا چاہا، تو ایک بدمعاش نے بچے کو اٹھا لیا اور اسے مارنے کی دھمکی دی۔ مسٹر مارٹن نہ مانے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بچے کو چھڑانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ انھوں نے ہمیں فون کر ڈالا، ہم تو پہنچ گئے لیکن۔"

"لیکن کیا؟" ہلرڈ نے بے تابی سے پوچھا۔

"ہمارے وہاں پہنچنے سے پہلے چور بچے کا گلا گھونٹ کر فرار ہو چکے تھے۔"

ہلرڈ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے رالف کی صورت گھوم گئی۔ پھر اس نے تصویر پر ایک نظر ڈالی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ بچہ اپنا رالف ہو۔ اس کے اس کے حلق سے ایک مدھم سی کراہٹ نکلی۔

"کیا بات ہے مسٹر ہلرڈ، آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" انسپکٹر نے گھبرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں انسپکٹر صاحب، ذرا طبیعت خراب ہے اسلئے سے گزر رہا تھا کہ اچانک پیٹ میں درد اٹھا۔ میں نے سوچا کچھ دیر آرام کرلوں۔"

انسپکٹر نے فوراً اس کے لیے بستر تیار کرنے کا حکم دیا اور ڈاکٹر کو فون کر ڈالا۔ تھوڑی دیر بعد ہلرڈ نرم اور آرام دہ بستر پر لیٹا تھا، اور ڈاکٹر اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ دوا پینے کے بعد اس نے

اس نے انسپکٹر سے اجازت چاہی۔ انسپکٹر مصر تھا کہ اُسے رات یہیں گزارنی چاہیے۔ لیکن ہارڈ نے اس کی ایک نہ سُنی۔ آخر انسپکٹر نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"چلیے۔ میں آپ خود پہنچا کر آتا ہوں۔"

"نہیں نہیں، مَیں خود ہی چلا جاؤں گا۔"

انسپکٹر نے اصرار کیا، لیکن ہارڈ نے بڑی سختی سے اس کی پیشکش مسترد کر دی اور خاموشی سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد اس کی کار انتہائی تیزی سے ہارڈ ہاؤس کی طرف دوڑ رہی تھی۔ راستے میں ایک جگہ رُک کر اُس نے شراب کی چند بوتلیں خریدیں تاکہ گرفن کو مطمئن کر سکے کہ وہ ان کے لیے شراب خریدنے گیا تھا۔ جب اس کی کار پورچ میں داخل ہوئی، تو وہ تینوں باہر صحن میں کھڑے تھے۔ ان کے چہرے زرد اور ستے ہوئے تھے۔ روبش اُسے دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور جیب سے چاقو نکالنے ہی والا تھا کہ گرفن نے اس کا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"کہاں گئے تھے تم؟" ہبنگ نے غرّا کر پوچھا۔

"میں آپ لوگوں کے لیے شراب خریدنے گیا تھا۔ تمھیں معلوم ہی ہے، میں شراب نہیں پیتا، اسی لیے گھر میں اس کی ایک بوند تک نہ تھی۔"

"تم جھوٹ بول رہے ہو، تم پولیس کو ہماری خبر دینے گئے تھے، ذلیل، مکّار، ہم تمھیں جیتا نہیں چھوڑیں گے۔"

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں، مجھے تم سے کیا ہوا وعدہ اچھی طرح یاد ہے۔ میں رات بھر کے لیے تمھیں پناہ دے چکا ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔" یہ کہہ کر ہارڈ نے بوتلیں زمین پر رکھ دیں اور خاموشی سے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر تک تینوں کھُسر پھُسر کرتے رہے۔ پھر شاید گرفن کے اطمینان دلانے پر وہ سب اندر چلے گئے۔

دس بجے کے قریب صدر دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجی۔ ہارڈ ہڑبڑا کر بستر سے اُٹھا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے، اس نے سوچا اور نائٹ گون پہن کر تیزی سے سیڑھیاں اُترتا ہوا ڈرائنگ روم میں آ گیا۔ ہبنگ اور روبش اُٹھ بیٹھے تھے اور آنکھیں مَل رہے تھے۔ گرفن ابھی تک دروازے پر پہرہ دے رہا تھا۔ ہارڈ کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں خون آ گیا۔

"معلوم ہوتا ہے تم سے کوئی حماقت سرزد ہو گئی ہے، ورنہ اس وقت یہاں کون آ سکتا تھا۔"

گھنٹی دوبارہ بجی اور دیر تک بجتی رہی۔

"ٹھہرو! میں دیکھتا ہوں۔"

ہلرڈ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر نکل گیا۔ چاند بادلوں کی اوٹ میں تھا، اس لیے چاروں طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ صدر دروازے پر لگے ہوئے بلب کی روشنی میں اس نے سایے کو دیکھا۔ ابھی وہ دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ وہ سایہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

"انکل، لیکن کیسی ہے؟" یہ جک رائٹ تھا۔

"اچھی ہے، اب تو بالکل اچھی ہے اور سو رہی ہے۔" ہلرڈ نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"میں نے سونے کی بہت کوشش کی، لیکن نیند نہیں آئی۔ سوچا سین کا پتہ لے آؤں۔ ممکن ہو آپ لوگوں کو میری مدد کی ضرورت ہو۔"

"لیکن تم اس وقت کیوں چلے آئے، فون کر لیا ہوتا۔"

"اصل میں میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔"

ہلرڈ کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار پیدا ہو گئے۔ اس نے بڑی بیچارگی سے اپنے سامنے کھڑے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا جو رات کے دس بجے اپنی منگیتر کو دیکھنے چلا آیا تھا۔

"تم پیدل آئے ہو، گاڑی کہاں ہے تمھاری؟" اس نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"گاڑی میں پٹرول نہیں تھا۔ میں ٹیکسی پر آیا ہوں۔ اب تو شاید واپس بھی نہ جا سکوں۔ کوئی بات نہیں، میں یہیں سو رہوں گا۔ صبح یہیں سے دفتر چلا جاؤں گا۔"

ہلرڈ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ پہلے تو وہ اسے اندر جانے سے روکنے کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ اب ایک نئی مصیبت نے آن لیا۔ رائٹ رات بھر یہیں رہنے کی سوچ رہا تھا۔ نہیں نہیں، وہ اندر نہیں جا سکتا۔ اسے اندر نہیں جانا چاہیے، ورنہ سارا معاملہ خراب ہو جائے گا۔ ابھی وہ اسی ادھیڑبن میں تھا کہ رائٹ بولا:

"انکل، آپ کس سوچ میں پڑ گئے، شاید آپ میرے لیے کمرہ تیار کرانے کی فکر میں ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ میں کوئی غیر ہوں۔ کسی انتظام کی ضرورت نہیں۔ بس سین کو ایک نظر دیکھ کر میں ڈرائنگ روم میں صوفے پر لیٹ جاؤں گا۔"

ہلرڈ کی آنکھوں کے سامنے ڈرائنگ روم لہرا گیا۔ تین بدمعاش، ایک بندوق، ایک پستول اور ایک چاقو۔ اب کیا کیا جائے؟ اس نے سوچا۔ ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں آیا،

اس نے رائٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تشویشناک لہجے میں کہا:۔

"سین کی طبیعت کچھ اچھی نہیں"۔

"اچھی نہیں؟ لیکن آپ تو کہہ رہے تھے، وہ بالکل ٹھیک ہے"۔

"میں تمھیں پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا، لیکن اب تم آگئے ہو۔ میری اپنی طبیعت ناساز ہے، ورنہ میں خود اُسے ہسپتال لے جاتا۔ دو تین مرتبہ ڈاکٹر کو فون کر چکا ہوں، لیکن وہ شاید کہیں باہر گیا ہے۔ میں نے اسے نیند کی گولیاں دی تھیں۔ اب اس کی آنکھ کھلی ہے۔ اگر تم اُسے بُرا محسوس نہ کرو، تو اسے کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ"۔

"اس میں بُرا محسوس کرنے کی کیا بات ہے انکل۔ آپ بھی غضب کر رہے ہیں۔ آپ بہت زیادہ پریشان دکھائی دیتے ہیں۔ چلیے، میں اسے ساتھ لے جاتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ اندر کی طرف بڑھا۔ ہلرڈ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اس وقت اسے روکنا اس کی طاقت سے باہر تھا اور اندر ڈرائنگ روم میں تین خونی اس کا انتظار کر رہے تھے۔

"رائٹ ذرا میری بات سُنو تو"۔

رائٹ رُک گیا۔ ہلرڈ نے قریب جا کر کہا:۔

"تم قریبی چوک سے ٹیکسی لے آؤ، اتنی دیر میں میں سین کو نیچے لے آتا ہوں"۔

"ٹیکسی؟ اس کی کیا ضرورت ہے، میں سین کی کار لے جاتا ہوں"۔

اس کی چھت نہیں ہے اور اس حالت میں سین کا کھلی چھت کی گاڑی میں جانا مناسب نہیں۔ میرا مطلب ہے سردی بہت ہے، کہیں اسے نمونیہ نہ ہو جائے"۔

"تو میں آپ کی کار لے جاتا ہوں"۔

میری کار کے انجن میں کچھ خرابی ہے۔ آج راستے میں مجھے دو مرتبہ رُکنا پڑا۔ چلتے چلتے اس کا انجن بند ہو جاتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ راستے میں دھوکا دے جائے"۔

"ٹھیک ہے، آپ سین کو تیار کریں، میں ٹیکسی لے کر ابھی آتا ہوں"۔ یہ کہہ کر وہ تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔

ہلرڈ کی جان میں جان آئی۔ وہ تیزی سے ڈرائنگ روم میں گیا اور ایک ہی سانس میں سب کچھ گرفن سے کہہ ڈالا۔ اس نے اوپر جا کر ایلن کو صورتِ حال بتائی اور اسے ساتھ لے جا کر دوڑتا ہوا سین کی خواب گاہ میں داخل ہو گیا ـــــ اس نے جلدی سے سین کو جگایا اور سارا پروگرام سمجھا کر اُسے

شب خوابی کے لباس ہی میں نیچے لے آیا۔

"تم کہنا میرے پیٹ میں سخت درد ہے اور ہاں رات وہیں ہسپتال میں رُک جانا، واپس نہ آنا، ورنہ رائٹ بھی تمھارے ساتھ آئے گا۔ جلدی کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ رائٹ ٹیکسی لے کر آجائے۔"

"لیکن ابّی، میں جوتا تو پہن لوں۔"

"نہیں، بیٹی، اس طرح دیر ہو جائے گی۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ ننگے پاؤں چلی جاؤ ــــــ اور ہاں، دیکھو، رائٹ سے کچھ نہ کہنا۔ میرا مقصد ہے کہ اس پر یہ ظاہر نہ ہونے دینا کہ ہمارے گھر میں کوئی غیر معمولی حادثہ پیش آگیا ہے۔ دیکھنا، تمھاری امّی اور بھیا کی جانیں تمھارے ہاتھ میں ہیں۔ اگر تم نے احتیاط سے کام نہ لیا تو ...."

"اگر تم نے اپنے منگیتر کو سب کچھ بتا دیا، تو یہ بہت بُرا ہوگا۔ تم خواہ پچاسوں سپاہی ساتھ لیکر آؤ۔ ان کے آنے سے پہلے ہم تمھاری ماں، باپ اور بہن کو ضرور ختم کر دیں گے۔ دیکھو لڑکی، ہم نے پہلے کافی قتل کیے ہیں۔ تین اور سہی۔"

سین کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ وہ اپنے آپ پر بمشکل قابو پاتے ہوئے بولی۔

"آپ بالکل فکر نہ کریں۔ مجھے امی، ابّا اور بھیا اپنی جان سے زیادہ عزیز ہیں۔"

"صبح ہوتے ہی دفتر چلی جانا اور دیکھو کل عین وقت پر واپس گھر پہنچ جانا، ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ کوئی گڑبڑ ہے، ہم چاہتے ہیں کہ اس گھر کے تمام کام حسب معمول ہوتے ہی رہیں تاکہ کسی کو شک نہ پڑے۔

باہر پھاٹک میں ٹیکسی داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ ایلن اور ہلرڈ نے سین کو پکڑ لیا اور اسے باہر لے گئے۔ رائٹ نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور سین کو اندر لٹا دیا۔ سین بڑے غضب کی اداکاری کر رہی تھی۔ بار بار اس کا سر دائیں بائیں ڈھلک جاتا۔

"میں نے کہا تھا نا کہ ہم نے اسے نیند کی گولیاں دے دی تھیں۔" ہلرڈ نے وضاحت کی۔

ایلن نے اُسے کمبل اڑھا دیا۔ اچانک رائٹ کی نظر اس کے ننگے پیروں پر پڑی۔

"یہ کیا؟ ہائیں، اس نے جوتا بھی نہیں پہن رکھا۔ آپ اسے پکڑ کر رکھیں میں بھاگ کر اس کا جوتا اٹھا لاؤں۔" اس کے پیروں کو سردی لگ گئی، تو اچھا نہ ہوگا۔"

یہ کہہ کر وہ پھر ایک مرتبہ ڈرائنگ روم کی طرف لپکا، لیکن سین کی ایک لمبی چیخ نے اُسے واپس بلا لیا۔ وہ اپنا سر اگلی سیٹ پر پٹخ رہی تھی۔

"دیر نہ کرو رائٹ، اسے فوراً ہسپتال لے جاؤ۔ ہائے میری بچی!" ایلین نے گھگھیا کر کہا۔

رائٹ نے فوراً تعمیل کی اور ٹیکسی چل دی۔ ہلرڈ اور ایلین کچھ دیر تک دھند میں غائب ہوتی ہوئی سُرخ بتیوں کو دیکھتے رہے اور پھر بوجھل قدموں سے واپس آ گئے۔

ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے گرفن نے اس سے پوچھا:۔

"سب ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، آپ لوگ مطمئن رہیں۔ وہ صبح سے پہلے واپس نہیں آئے گی۔"

گیارہ بجے کے قریب ہلرڈ دوبارہ بستر پر لیٹا، لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بار بار اُس کا خیال ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے ان تین آدمیوں کی طرف چلا جاتا جنھوں نے شام سے گھر میں آفت مچا رکھی تھی۔ ہلرڈ کو جرم سے سخت نفرت تھی، وہ ایک سیدھا سادا تاجر تھا۔ یہ احساس اسے بار بار تکلیف دے رہا تھا کہ اس نے انصاف کا ساتھ دینے کے بجائے تین مجرموں کو پناہ دے رکھی ہے۔ ہر بار وہ اپنے آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کرنے کی کوشش کرتا کہ صبح ہوتے ہی وہ چل دیں گے، مگر ندامت کا احساس اس قدر شدید تھا کہ وہ دوبارہ اسی مسئلے پر غور کرنے لگتا۔ اچانک اس کے ذہن میں ان سے بدلہ لینے کا خیال پیدا ہوا۔ اس وقت روبش اور گرفن سو رہے تھے اور ہینک پہرے دے رہا تھا۔ اسکی نظروں کے سامنے ہینک کا سیدھا سا معصوم چہرہ لہرا گیا۔ اسے چت کرنا، باقی دو مجرموں کی نسبت زیادہ آسان ہے۔ بستر پر لیٹے لیٹے وہ اپنے منصوبے پر غور کرنے لگا۔ سیڑھیاں اُترتے ہی اگر وہ ہینک کو اوپر بُلائے، تو وہ فوراً چلا آئے گا۔ بالائی برآمدے میں پہنچ کر وہ بڑی آسانی سے اس کی بندوق چھین سکتا ہے۔ بندوق پاس ہو، تو نیند میں ڈوبے ہوئے دو قاتلوں کو کسی کمرے میں بند کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ اس کے بعد پولیس اسٹیشن کو ایک فون کرنا ہوگا اور سارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ذرا سی دیر میں انسپکٹر جیسی دیپ آٹھ، دس سپاہیوں کے ساتھ آ جائے گا۔ چشمِ تصوّر سے اس نے تینوں مجرموں کو انسپکٹر کے ہاتھوں گرفتار ہوتے دیکھا اور مسکرا دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ اُٹھا اور دبے پاؤں سیڑھیاں اُترتا ہوا ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔ گرفن صوفے پر دراز تھا اور روبش فرش پر چاروں شانے چت سو رہا تھا۔ قریب ہی دو چار خالی بوتلیں پڑی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے سونے سے پہلے جی بھر کے شراب پی ہے۔ ہینک بندوق کندھے سے لٹکائے آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ نیند سے اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ اُس کا سر بار بار آگے کی طرف ڈھلک جاتا۔

"ہینک ذرا ادھر آنا!" ہلرڈ نے آہستہ سے کہا۔

ہینک ہڑبڑا کر اُٹھا اور بغیر سوچے سمجھے اوپر کی طرف چل دیا۔

"کیا ہے مسٹر ہلرڈ؟"

"میں نے پھاٹک پر کسی شخص کا سایہ دیکھا ہے، سوچا تمہیں بُلا لوں۔"

وہ جنگلے کی طرف جا کر رُک گئے اور جھک کر نیچے کی طرف دیکھنے لگے۔ ہلرڈ نے دونوں ہاتھوں کی مُٹھیاں کس لیں اور پوری قوت سے ہینک کی جھکی ہوئی کمر پر ضرب لگائی۔ ایک لمحے کے لئے ہینک لڑکھڑا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جوابی حملہ کرے ہلرڈ نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو مروڑ دیا اور دوسرے ہاتھ سے بندوق کندھے سے اُتار لی۔ اسے بندوق چلائے دس بارہ سال ہو چکے تھے۔ جوانی میں وہ شکار کا بے حد شوقین تھا، لیکن یہاں بندوق چلانا درکار بھی نہیں تھا۔ ہینک نے اسے خوفزدہ نظروں سے دیکھتے ہوئے دونوں ہاتھ اوپر اُٹھا لیے۔ ہلرڈ نے اسے اسٹور روم میں بند کر دیا اور باہر سے کنڈی لگا کر دبے پاؤں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ اس وقت اس نے سوچا کہ گرفن کے پاس ایک پستول بھی ہے، لیکن اس خیال نے اسے تقویت دی کہ وہ اس وقت سو رہا ہوگا۔ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے اس نے ایک نظر روبش کی طرف دیکھا، وہ اسی طرح مدہوش پڑا تھا۔ اس کے بعد اس کی نظر صوفے کی طرف اُٹھ گئی جہاں گرفن سو رہا تھا۔ چاروں طرف دیکھنے کے بعد چھوٹے چھوٹے محتاط قدم اُٹھاتا ہوا کمرے کے وسط میں پہنچ کر رُک گیا۔ اُس نے گرفن کے مُنہ پر سے کمبل ہٹایا ہی تھا کہ خوف کی ایک لہر اس کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے ٹھنڈے قطرے نمودار ہو گئے اور بندوق پر اُس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ کمبل کے نیچے گول تکیہ پڑا تھا۔ گرفن غائب تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے اپنی گردن پر پستول کی ٹھنڈی نالی چُبھتی ہوئی محسوس کی۔

"بندوق نیچے پھینک دو۔" گرفن کی غصے میں بھری ہوئی آواز سنائی دی۔

ہلرڈ نے بندوق نیچے پھینک دی اور دونوں ہاتھوں سے سر کو پکڑے وہیں فرش پر بیٹھ گیا۔

"ہینک کہاں ہے؟"

"اوپر کمرے میں ہے۔"

"میرے ساتھ اوپر چلو۔"

وہ خاموشی سے اُٹھا اور گرفن کے آگے آگے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہینک سمیت دوبارہ نیچے پہنچ گئے۔

مسٹر ہلرڈ، تم نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ اب ہمیں تم پر اعتبار نہیں رہا۔ ہینک تم اوپر جا کر بیگم صاحبہ اور بیٹے کو لے آؤ۔ ہمیں تو موت کے گھاٹ اُترنا ہی ہے، لیکن انھیں ذرا مزا چکھائیں۔ اور دیکھو روبش کو جگا دو تاکہ وہ اپنا چاقو تیار کر لے، فائر سے آواز پیدا ہو گی۔"

ہلرڈ کی آنکھوں کے سامنے ایلین اور رالف کی لاشیں لہرا گئیں۔ خدا کے لیے، اوپر مت جاؤ، میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"

"تم نے پہلے بھی تو وعدہ کیا تھا" گرفن نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

اس مرتبہ میں اپنے بچے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ایسی غلطی نہیں ہو گی۔"

"ٹھیک ہے، ہم تمھیں ایک آخری موقع دے رہے ہیں۔ اگر تم نے اس مرتبہ بھی ہمیں دھوکا دینے کی کوشش کی، تو ہم سے بڑا کوئی نہیں ہو گا۔"

صبح حسین اور چکیلی تھی۔ سورج کی روپہلی کرنیں ہلرڈ ہاؤس کے آنگن میں کھلے ہوئے پھولوں سے کھیل رہی تھیں۔ پانچ بجے کے قریب ہلرڈ بستر سے اُٹھا۔ رات بھر وہ سونے کی کوشش کرتا رہا، لیکن نیند اُس کی آنکھوں سے کوسوں دور رہی تھی۔ شب بیداری کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نیچے ڈرائنگ روم میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بستر سے نکل کر ایلین کے کمرے کا رخ کیا، وہ بستر پر موجود نہیں تھی۔ وہ بھاگم بھاگ باورچی خانے میں پہنچا اور یہ دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی کہ ایلین وہاں موجود تھی، لیکن ایسی حالت میں کہ ٹھنڈے فرش پر اس کا جسم ساکت و جامد پڑا تھا۔ ہلرڈ نے اسکے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تب کہیں اسے ہوش آیا۔

"چائے تیار کرنے لگی تھی کہ گر پڑی"۔ اس نے کمزور لہجے میں وضاحت کی۔

ہلرڈ نے ایک نظر اُس کے اُترے ہوئے زرد چہرے پر ڈالی۔ ایک ہی رات میں وہ کس قدر بدل گئی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ اُس کے رخسار زرد اور پچکے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ رات بھر روتی رہی ہو۔ ہلرڈ نے پیار سے اس کا کندھا تھپتھپایا اور نیچے اُترنے لگا۔

ڈرائنگ روم میں زندگی کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ گرفن اور ہینک ایک دوسرے سے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ روبش البتہ ابھی تک فرش پر دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ ہلرڈ کے اندر آتے ہی گرفن بولا:۔

"مسٹر ہلرڈ، اچھا ہوا آپ آ گئے۔ ہم چاہتے ہیں ذرا تفصیل سے پروگرام پر غور کر لیں۔ سب سے پہلے آپ یہ بتائیے کہ اب اس گھر میں کون کون آئے گا۔"

"پہلے دودھ والا آئے گا، اس کے بعد دن میں کام کاج کرنے والی ملازمہ۔"

"ٹھیک ہے آپ باہر کھڑے ہو جائیے اور یہ ظاہر کیجئے کہ صحن میں چہل قدمی کر رہے ہیں۔

جونہی دودھ والا آئے، اس سے دودھ لیجئے۔ اسے کسی قیمت پر اندر نہ آنے دیا جائے۔ مسز ہلرڈ سے

کہہ دیجئے کہ وہ بھی صحن میں آجائے اور ملازمہ کو باہر ہی سے واپس بھیج دے۔"

"بہت بہتر۔"

"سین واپس آجائے تو اسے دفتر بھیج دیجئے اور خود بھی عین وقت پہ کام پر پہنچ جائیے۔

اپنے معمولات جاری رکھیے۔ آپ کی کسی حرکت سے ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ گھر میں کوئی غیر معمولی واقعہ

پیش آیا ہے اور ہاں رالف کو سکول نہ بھیجیے۔ ابھی بچہ ہے ممکن ہے کسی سے کہہ دے، لیکن اس کے اسکول

میں چھٹی کے لیے ایک درخواست ضرور بھیج دیجئے تاکہ اس کے دوست یا استاد وغیرہ متفکر ہو کر یہاں نہ آدھمکیں۔

درخواست میں لکھ دیجئے کہ اسے بخار ہے، اس لیے آج حاضر نہیں ہو سکے گا۔ اسے باہر کھیلنے کے لیے نہ جانے دیجئے،

ورنہ وہ ہمسایوں تک ضرور بات پہنچا دے گا۔ آج آپ کی ڈاک میں ایک رجسٹری ملے گی، اسے احتیاط سے

وصول کر لیجئے اور شام کو واپس آتے ہوئے بحفاظت یہاں تک لے آئیے۔ رجسٹری ملتے ہی گھر کا رُخ

نہ کیجئے گا، ورنہ لوگوں کو خوامخواہ شک پڑ جائے گا۔"

ہلرڈ نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر صحن میں نکل آیا۔ اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا،

دودھ والا جلد ہی آپہنچا۔ اس نے بوتلیں لیکر رکھ لیں اور اسے باہر ہی سے رخصت کر دیا۔ عام طور پر ایلن کو

محلّے بھر کی خبریں سُنا کر جایا کرتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ملازمہ بھی آپہنچی۔ اُس نے باہر ہی روک لیا۔

"مسز رابسن، آج ہم سب پکنک منانے جا رہے ہیں، اس لیے گھر پر کوئی کام نہیں، آج تم

آرام کرو۔"

اس کام سے فارغ ہو کر اس نے ناشتہ کیا۔ ہسپتال میں سین کو فون کیا کہ گھر آنے کے بجائے

سیدھی دفتر پہنچ جائے۔ رالف کے سکول میں اس کی فرضی بیماری کی اطلاع دی اور پھر دکان کو

روانہ ہو گیا۔

پولیس اسٹیشن میں انسپکٹر جیسی دیپ اپنے ماتحتوں پر غضبناک ہو رہا تھا: "میں کہتا ہوں

وہ سب کہاں مر گئے۔ شہر سے باہر وہ نہیں نکلے، گاڑی ان کی نہیں مل رہی، آخر ایک کار سمیت تین آدمی کہاں

غائب ہو سکتے ہیں؟ میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ صاحب کو یقین دلا چکا ہوں کہ آج شام تک انھیں ڈھونڈ نکالیں گے۔

ریڈیو پر اعلان کروا دو، اشتہار چھپ چکے ہوں، تو انھیں شہر کے کونے کونے میں تقسیم کرا دو۔ دیواروں پر

بڑے سائز کے اشتہار لگوادو جن میں ان تینوں کی تصویریں لگی ہوں شہر سے باہر نکلنے والی سڑکوں پر پہرہ سخت کردو، شہر کے ہر پل پر اچانک چھاپے مارو، ریلوے سٹیشن پر مقررہ سفید پوش سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ کردو۔ میں ہر قیمت پر انھیں آج شام تک گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔"

گیارہ بجے کے قریب پہلی ڈاک موصول ہوئی۔ ہلرڈ نے کلرک کے بجائے خود پوسٹ مین سے بات کی، لیکن اس میں رجسٹرڈ لفافے کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اس نے فون پر ایلن کو اطلاع کردی اور خود دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامے آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ بارہ بجے کے قریب ایلن اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ عام طور پر وہ دوپہر کا کھانا اکٹھے کھایا کرتے تھے، لیکن آج اُسے بھوک نہیں لگ رہی تھی۔

"الی، مجھے ایک تدبیر سوجھی ہے۔"

"کیا؟"

"ہم ان لوگوں سے پوچھیں گے کہ انھیں کس قدر رقم کی ضرورت ہے اور انھیں خود ہی یہ رقم دے دیں۔ اِس طرح یہ لوگ ہمارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔"

ہلرڈ کچھ دیر سوچتا رہا۔ تجویز معقول تھی۔ گھر میں اس طرح قاتلوں کو چھپائے رکھنے سے بہتر تھا کہ کچھ رقم دے کر اپنی جانیں محفوظ کرلی جائیں۔"

"ٹھیک ہے، آج گھر چل کر اُن سے بات کریں گے۔"

دن کے ایک بجے ہلرڈ ہاؤس کے بیرونی پھاٹک پر لگی ہوئی گھنٹی بجی۔ رونش نے جنگلے سے جھانک کر دیکھا۔ تیس پینتیس برس کی ایک عورت چشمہ لگائے اور ہاتھ میں چند کتابیں لیے باہر کھڑی تھی۔ اس نے تیزی سے سیڑھیاں عبور کیں اور ڈرائنگ روم میں گرفن کو اس کی اطلاع کردی۔

"مسز ہلرڈ، ہم خواب گاہ میں چھپ جاتے ہیں، آپ اس خاتون کو اندر بلا لیجئے، لیکن دیکھیے کہیں رالف اس سے سب کچھ نہ کہہ دے۔"

ذرا سی دیر بعد مس فلاور مسکراتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔

"مجھے پتہ چلا تھا کہ رالف کی طبیعت خراب ہے، اب چھٹی ہوئی تو سوچا اُسے ایک نظر دیکھتی چلوں۔"
کچھ دیر تک وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی رہی، پھر اُٹھ کر رالف کے کمرے کی طرف چل دی۔ رالف بستر میں لیٹا تھا، صبح سے اُسے باہر نکلنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ اُستانی کو دیکھتے ہی اس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اس اثنا میں ایلن گرفن کی خواب گاہ میں یہ بتانے کے لیے گئی کہ ملاقاتی خاتون رالف کی اُستانی ہے۔ جب وہ واپس آئی تو مس فلاور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا، اب مجھے اجازت دیجئے۔"

مسز ہلرڈ اُسے دروازے تک چھوڑنے گئیں۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ اوپر رالف کے پاس پہنچیں، تو وہ زور زور سے قہقہے لگا رہا تھا۔

"کیا ہوا رالف، دماغ تو نہیں چل گیا تمھارا؟"

"کچھ نہیں امّی۔"

لیکن ذرا سی دیر میں مسز ہلرڈ کو پتہ چل گیا کہ رالف کے وحشیانہ قہقہوں کا مطلب کیا تھا؟ اچانک دروازے پر دوبارہ گھنٹی بجی اور مس فلاور گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"مسز ہلرڈ، معلوم ہوتا ہے کہ رالف کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔"

"کیوں کیا ہوا؟"

"یہ دیکھو نا، اُس نے میرے پرس میں یہ خط لکھ کر رکھا ہے۔ لکھا ہے: "ہمارے گھر میں تین قیدی چھپے ہوئے ہیں، وہ ہمیں پولیس کو اطلاع کرنے نہیں دیتے۔ آپ یہ خط پولیس سٹیشن پہنچا دیں، مہربانی ہوگی"۔ اب بھلا آپ ہی بتائیے کہ ایسی باتیں کوئی صحیح الدماغ بچہ لکھ سکتا ہے۔"

ایلین کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ مس فلاور نے خط اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولی :۔

"مجھے اپنی بڑی بہن کے ہاں جانا ہے، ورنہ میں خود آپ کے ساتھ چلتی۔ میری رائے میں آپ اسے فوراً ہسپتال لے جائیں۔ کل تک تو اچھا بھلا تھا، شاید بخار کی وجہ سے دماغ پر بُرا اثر پڑا ہو۔"

"بہت بہتر، میں ابھی لے کر جاتی ہوں۔"

دروازہ بند ہوگیا، تو مسز ہلرڈ کی جان میں جان آئی اور وہ بوجھل قدموں سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

سوا پانچ بجے سیین اور ہلرڈ گھر پہنچے۔ گرفن کو علیحدہ کمرے میں لے جاکر ہلرڈ نے اپنی تجویز پیش کی، لیکن اُسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔

"مسٹر ہلرڈ، رقم وصول کیے بغیر ہم یہاں سے نہیں جاسکتے اور پھر آپ اتنی رقم ادا بھی تو نہیں کرسکتے۔ لائیے، اگر آپ کے پاس پچاس ہزار ڈالر ہیں، تو ہمارے حوالے کیجئے۔"

شام تک کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہوا۔ رائٹ نے دو مرتبہ فون کیا اور ہر دفعہ سیین نے خود اُسے تسلّی دی کہ اس کی صحت بالکل ٹھیک ہے۔ سات بجے کے قریب ہلرڈ کا اکاؤنٹنٹ اس سے چند

کاروباری امور کے بارے میں مشورہ لینے کے لیے آیا، لیکن ہلرڈ نے اُسے باہر ہی سے واپس کر دیا۔ رات کے کھانے کے بعد گرفن نے ہلرڈ کو بلایا اور شام کا اخبار دکھاتے ہوئے بولا۔

"پولیس نے سلیٹی رنگ کی کار تلاش کرنا شروع کر دی ہے۔ صبح سے سارے شہر میں چھاپے مارے جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے ٹھکانے لگا دیا جائے۔"

"وہ کیسے؟"

"آپ اسی وقت بازار جائیں اور بیس بچیس رنگ کے ڈبے خرید لائیں۔ ہم سب مل کر گاڑی کا رنگ تبدیل کر دیں گے۔ اس کے بعد آپ اسے رات کی تاریکی میں باہر چھوڑ آئیں۔"

"میں چھوڑ آؤں؟ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ موجودہ حالات میں آپ کے سوا یہ کام اور کون انجام دے سکتا ہے۔"

"لیکن۔"

لیکن ویکن کچھ نہیں۔ مسٹر ہلرڈ، آپ خاموشی سے تعمیل کیجیے، ورنہ......"

ہلرڈ نے ایک نظر سہمے ہوئے رالف کی طرف دیکھا اور پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ تینوں آستین چڑھائے کار پر نیلا رنگ کرنے میں مصروف تھے۔ گیراج میں اندھیرا تھا لیکن انھوں نے جان بوجھ کر بتی نہیں جلائی تھی، کیونکہ اس طرح ہمسایوں کو شبہہ پڑ سکتا تھا۔ چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ کار کی چمکیلی سطح پر اندھا دھند برش مار رہے تھے۔ گیارہ بجے کے قریب وہ اس کام سے فارغ ہوئے۔ اس دوران میں گرفن باہر پہرہ دیتا رہا۔ گرم پانی سے غسل کرنے سے ہلرڈ کی ساری تھکن دور ہو گئی۔ اس نے کپڑے بدلے اور زندگی میں پہلی مرتبہ ایک انوکھی مہم کے لیے تیار ہو گیا۔ اس اثنا میں گرفن کار کی نمبر پلیٹ اُتار چکا تھا اور سبین کی چھوٹی گاڑی کی پلیٹیں اس کار پر لگا رہا تھا۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو سبین کو اپنی گاڑی پر میرے پیچھے بھیج دیں، تاکہ وہ مجھے واپس لا سکے۔" ہلرڈ نے گرفن سے مخاطب ہو کر کہا۔

"نہیں، دو گاڑیوں کے آگے پیچھے چلنے سے پولیس کو شبہہ پڑ سکتا ہے۔ تمھیں احتیاط سے کام لینا ہو گا۔ آج ہر چوک پر پولیس سلیٹی رنگ کی کار کو تلاش کر رہی ہو گی۔"

باہر ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی، شاید کہیں اولے پڑے تھے۔ رات کے وقت سوا بارہ بجے ہلرڈ ہاؤس سے گہرے نیلے رنگ کی ایک کار باہر نکلی اور شہر سے باہر جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔ تھوڑی دیر میں وہ گنجان آبادی سے باہر نکل آیا۔ اب صرف اِکّا دُکّا مکان نظر آ رہے تھے۔ دور دور تک سبزہ

پھیلا ہوا تھا۔ چراگاہیں، باغ اور کھلے میدان تھے جو ہلکی ہلکی چاندنی میں بڑے پُراسرار دکھائی دے رہے تھے۔ چیکنگ پوسٹ سے پہلے ہلرڈ نے گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ چشم زدن میں وہ آخری خطرناک مقام بھی عبور کر گیا۔ پون بجے وہ دریا کے پُل پر پہنچ گیا۔ یہاں سے ایک کچی سڑک دریا کے پیٹ میں اُترتی تھی۔ اُس نے گاڑی کی رفتار آہستہ کر دی اور اسے کچی سڑک پر چلانے لگا۔ ایک ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ ایک ایسی جگہ پر پہنچا جہاں سڑک کے ساتھ ہی پانی شروع ہو جاتا تھا۔ یہاں ارد گرد گھنے درخت تھے، اس لیے دن کے وقت یہ بھی جگہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہتی تھی۔ اُس نے گاڑی کا رُخ دریا کی طرف کر دیا اور خود باہر نکل کر اُسے پوری رفتار پر چھوڑ دیا۔ گہرے نیلے رنگ کی گاڑی سوکھی شاخوں اور گھاس کے تختوں کو چشم زدن میں پھلانگتی ہوئی دریا کے گہرے پانی میں غائب ہو گئی۔ ہلرڈ نے جیب سے برقی ٹارچ نکال کر اس کی روشنی میں دریا کی طرف دیکھا، وہاں کار کا نام و نشان نہ تھا۔ صبح ساڑھے سات بجے جب وہ آٹھ میل کا فاصلہ طے کر کے گھر پہنچا، تو اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا۔

تیسرے دن نو بجے کے قریب ہلرڈ تیار ہو کر گھر سے نکلا۔ اُس کی طبیعت ناساز تھی۔ رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور آٹھ نو میل کی پیدل مسافت سے اس کا جسم پھوڑے کی طرح درد کر رہا تھا لیکن دفتر پہنچنا بھی ضروری تھا کیونکہ آج گرفن کی رقم کے پہنچنے کی توی امید تھی اور ویسے بھی گرفن چاہتا تھا کہ ہر کام حسب معمول ہو۔ دس بجے کے قریب جب گھر میں تینوں مجرموں کے علاوہ صرف ایلین اور رالف رہ گئے۔ مس جاسمن پھاٹک سے اندر آتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ موٹی تازی ہنس مکھ لڑکی تھی اور بہت سے گھروں میں برتن دھونے کا کام کرتی تھی۔ اس کے پاس ایک پُرانی سی موٹر کار تھی جو چلتے وقت بے انتہا شور کرتی تھی۔

"مسٹر ہلرڈ، لائیے مہینے بھر کی کارگزاری"، وہ دروازے میں داخل ہوتے ہی بولی اور اس سے پہلے کہ گرفن اور اس کے ساتھی سنبھل سکتے، وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئی۔ اس نے ایک نظر تینوں مجرموں پر ڈالی اور دہشت زدہ ہو کر واپس مُڑنے لگی۔ گرفن نے اُسے زبردستی کھینچتے ہوئے کہا۔

"کیا بات ہے، تمہیں کس سے ملنا ہے؟"

"کسی سے نہیں"، وہ خوف زدہ ہو کر چلائی۔ اس اثنا میں ایلین سیڑھیاں اُتر کر نیچے آ چکی تھی۔

"کیا بات ہے جاسمن، تم چیخ کیوں رہی ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یہ لوگ کون ہیں؟"

"ہلرڈ کے دوست ہیں، کیوں کیا ہوا؟"

"آپ جلدی سے مجھے پیسے دے دیں۔ مجھے تو ان سے ڈر لگ رہا ہے۔ ان کی شکلیں تو خونیوں کی سی ہیں"۔

ایلن نے جلدی سے چیک کاٹ کر اس کے حوالے کیا اور وہ توبہ توبہ کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ میں شام کا اخبار تھا۔

"مسز ہلرڈ، بھلا دیکھئے تو ان لوگوں کی شکلیں ان مجرموں سے نہیں ملتیں جو پرسوں جیل سے بھاگے تھے"۔

"میرا خیال ہے تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ تو مسٹر ہلرڈ کے بچپن کے دوست ہیں"۔ مسز ہلرڈ تھوک نگلتے ہوئے بولی۔

"اچھا، تو مجھے اجازت دیجئے"۔ یہ کہہ کر وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ گرفن نے روبش کی طرف دیکھا۔ اگلے ہی لمحے روبش کا جسم کمرے سے باہر لپکتا ہوا دکھائی دیا۔

جاسمن تیزی سے کار چلا رہی تھی۔ اچھا تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں جگہ جگہ اشتہار لگے ہوئے ہیں، لیکن ہلرڈ کا ان سے کیا تعلق ہے؟ اس نے سوچا اور پھر متفکرانہ انداز میں سر ہلانے لگی۔ مجھے ہر قیمت پر پولیس کو خبر دینی چاہئے۔ یہ سوچ کر اُس نے کار کا رُخ پولیس سٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ ڈبل روڈ کا چوک عبور کرتے ہی اُسے اپنی کمر پر کسی تیز چیز چبھن محسوس ہوئی۔ اُس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور وہ سٹیرنگ پر ڈھیر ہو گئی۔ کار سڑک کے کنارے کھڑے ہوئے ایک ٹرک سے ٹکرانے والی تھی کہ دو مضبوط ہاتھوں نے سٹیرنگ کو سنبھال لیا۔ تھوڑی دیر تک کار آہستہ آہستہ چلتی رہی، پھر ایک نسبتاً ویران جگہ پر رُک گئی۔ روبش نے دروازہ کھولا اور پھرتی سے باہر نکل کر درختوں کے ایک جھنڈ میں غائب ہو گیا۔

گیارہ بجے کے قریب انسپکٹر جیسی ویپ ہسپتال میں جاسمن کی لاش پر جھکا ہوا اظہار افسوس کر رہا تھا۔

"جناب، جب اسے ہسپتال میں لایا گیا، تو یہ بیہوش تھی۔ ہوش میں آتے ہی اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ نکلے: مجرم، تینوں مجرم"۔ اور وہ دوبارہ بیہوش ہو گئی۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر کسی دھار آلے سے وار کیا گیا ہے"۔

اچانک جیسی ویپ کا چہرہ چمک اُٹھا۔

"کیا اس کی تلاشی لی گئی ہے؟"

"جی ہاں، یہ چیزیں اس کی جیب سے نکلی ہیں۔"

پچھلی شام کے تہہ کردہ اخبار کے علاوہ کوا پریٹو بنک کا ایک چیک جیسی ویپ کے سامنے پڑا

تھا جس پر مسز ہلرڈ کے دستخط تھے۔

"مطلب یہ کہ آخری مرتبہ یہ مسز ہلرڈ سے ملی تھی۔ میرا خیال ہے یہ نام میں نے سُن رکھا ہے۔ سارجنٹ تم فوراً کوا پریٹو بنک جاؤ اور مسز ہلرڈ کا پورا نام اور پتہ لے کر میرے پاس پہنچو۔"

"بہت بہتر۔"

تھوڑی دیر بعد جیسی اپنی میز پر بیٹھا واقعات کی کڑیاں ملانے میں مصروف تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور سارجنٹ دوڑتا ہوا اندر آیا۔

"جناب، مسٹر ڈان ہلرڈ، گرسن چوک میں ایک بہت بڑے سٹور کا مالک ہے اور کورٹ روڈ پر رہتا ہے۔ ایلن، مسٹر ہلرڈ کی بیوی ہے۔ چیک پر اسی کے دستخط ہیں۔ بینک میں اس گھرانے کے چار آدمیوں کے نام کچھ رقم جمع ہے۔ ڈان ہلرڈ، مسز ایلن ہلرڈ، سین ہلرڈ اور رالف ہلرڈ۔ سین اور رالف، مسٹر اور مسز ہلرڈ کے بچے ہیں۔ سین اٹھارہ سالہ لڑکی ہے اور ایک دفتر میں ٹائپسٹ ہے۔ رالف کی عمر بینک کے کاغذات میں دس سال لکھی ہے۔ ظاہر ہے وہ کسی سکول میں پڑھتا ہوگا۔"

"ان سب کے پتے لائے ہو؟"

"جی ہاں، یہ لیجیے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم میری کرسی پر بیٹھو اور جونہی کوئی تازہ خبر ملے مجھے اطلاع کر دینا۔ میں باری باری ان پتوں پر لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں۔"

اپنی اس مہم پر نکلنے سے پہلے جیسی ویپ نے پولیس کی وردی اُتار کر سادہ کپڑے پہن لیے۔ سب سے پہلے اس نے ہلرڈ سٹور کا رُخ کیا۔ وہاں اس وقت منیجر اور کاؤنٹر کلرک کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔

"کیا ہلرڈ چلا گیا ہے؟"

"جی ہاں، وہ پانچ بجے گھر چلے جاتے ہیں۔" منیجر نے اس کی بے تکلفی سے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"اب طبیعت کیسی ہے اس کی؟ معاف کیجیے گا، وہ میرا بہت پرانا دوست ہے، اس لیے میں اسے اسی طرح بلایا کرتا ہوں۔ کل مجھے معلوم ہوا تھا کہ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں۔"

"جی ہاں، دو تین دن سے ان کی طبیعت واقعی ناساز ہے۔ دن بھر کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں، بات بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔ آج تو انھوں نے کمال کر دیا، کہنے لگے: صبح کی ڈاک میں خود دیکھوں گا۔

تھوڑی دیر بعد اپنے کمرے سے نکلے تو میں نے انھیں بُلانے کی کوشش کی۔ مگر انھوں نے میری طرف ذرّہ برابر توجہ نہیں دی۔ بس چپکے سے دونوں ہاتھ کمر پر رکھے باہر نکل گئے، جناب، ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔"

"اچھا، تو مجھے اجازت دیجئے، میں اس سے گھر ہی پر مل لوں گا۔"

"بہت بہتر جناب۔"

یہاں سے نکل کر اُس نے سین کے دفتر کا رُخ کیا۔ سین گھر جا چکی تھی، لیکن جو لڑکی اُس کی جگہ کام کر رہی تھی، اس سے کافی معلومات حاصل ہوئیں جن کا حاصل یہ تھا کہ آج کل سین کسی تفریحی پروگرام میں شرکت نہیں کرتی اور سیدھا گھر کا رُخ کرتی ہے۔"

"کمال ہے جناب، کل میں اس کے ساتھ چوک تک گئی، تو وہ رازدارانہ لہجے میں بولی:

"جوڈی بہن، تمھارے پاس پستول ہے۔" سچ جانیے، میں تو اس بات سے ڈر گئی تھی۔ بھلا اسے پستول کی ضرورت کیسے پڑ گئی، لیکن اس نے بات بناتے ہوئے کہا کہ وہ مذاق کر رہی تھی۔ سچ جانیے مجھے تو یقین نہیں آیا۔ عجیب لڑکی ہے صاحب۔"

رالف کا سکول بند تھا، اس لیے جیسی کو مایوس لوٹنا پڑا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر وہ ایک بار پھر غور و فکر میں ڈوب گیا۔ واقعات گواہی دے رہے تھے کہ مجرم ہلرڈ کے ہاں چھپے ہوئے تھے، لیکن ان سے اس کا کیا رشتہ ہے۔ آخر وہ کس بنا پر اسے بلیک میل کر رہے تھے۔ اچانک اس کے دماغ میں بجلی کی طرح اس شخص کا خیال آیا جو تین روز پہلے رات کے وقت پولیس سٹیشن آیا تھا۔ اس کا نام بھی تو اس سے کچھ ملتا جلتا تھا۔ اس کے ذہن میں ہلرڈ کے پولیس سٹیشن آنے کا نقشہ گھوم گیا۔ اس نے گھنٹی بجائی۔ سارجنٹ کمرے میں داخل ہوا۔

"سارجنٹ، میں ہلرڈ سے ملنا چاہتا ہوں، تم اسے کسی بہانے سٹور میں بُلا سکتے ہو؟"

"بہت بہتر جناب۔"

تھوڑی دیر بعد ہلرڈ ہاؤس میں فون کی گھنٹی بجی۔

"کون صاحب ہیں؟" ہلرڈ نے خود ہی ریسیور اٹھایا۔

"میں سٹور سے بول رہا ہوں۔ سیلز ٹیکس والے اچانک آپہنچے ہیں۔ آپ فوراً سٹور میں پہنچ جائیے۔"

بہت بہتر میں ابھی آرہا ہوں، آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟"

دس منٹ بعد ہلرڈ سٹور کے عقبی کمرے میں داخل ہوا یہاں جیسی ویپ اس کا بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔

"انسپکٹر آپ!" ہلرڈ نے گھبرا کر کہا۔

"ہاں ہیں، مسٹر ہلرڈ، تشریف رکھیے، میں آپ سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے۔" ہلرڈ ہکلاتے ہوئے بولا۔ جیبسی نے جیب سے ایک اشتہار نکالا اور میز پر پھیلا دیا۔

"آپ ان مجرموں کو جانتے ہیں؟"

"جی، جی نہیں، مجھے ان سے کیا سروکار۔"

"کمال ہے بھئی، آپ اپنے مہمانوں کو نہیں پہچان سکتے۔"

ہلرڈ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے دو ایک مرتبہ اپنے خشک لبوں پر زبان پھیری اور پھر بچنے کی کوئی راہ نہ پاکر ساری بات بتادی۔ جیبسی ویپ خاموشی سے سنتا رہا اور پھر بولا:

"ابھی تک ان کی رقم نہیں پہنچی؟"

"نہیں، لیکن صبح گیارہ بجے رقم ملنے کا قوی امکان ہے۔"

"ٹھیک ہے، ہم صبح سات بجے تک اپنا کام کرلیں گے۔ کیا آپ اپنے گھر کا نقشہ بتا سکتے ہیں؟"

ہلرڈ نے کاغذ پر مکان کا نقشہ بنایا۔ دو اطراف خالی تھیں اور دو میں مکانات تھے۔

جیبسی کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر ہلرڈ سے مخاطب ہو کر بولا:

"ٹھیک ہے، کل بیس آدمی آپ کے ہاں پہنچ جائیں گے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ پچاس آدمی مکان سے کچھ دور چاروں طرف گھیرا ڈالے رہیں گے تاکہ مجرموں کو بھاگنے نہ دیں۔ میں خود اندر ہونگا۔ عین سات بجے ہم دھاوا بول دیں گے۔۔۔ آپ پونے سات بجے کسی بہانے گھر والوں کو باورچی خانے میں لے جاکر بند کر دیجیے۔ میں دودھ والے کے روپ میں ہوں گا، ایسا نہ ہو کہ آپ مجھے بھی پہچان نہ سکیں۔ اچھا، اب خدا حافظ! یہ باتیں کسی سے نہ کہیے۔ مسز ہلرڈ سے بھی نہیں۔ صبح سات بجے ملاقات ہو گی۔"

تھوڑی دیر بعد جیبسی ویپ دوبارہ پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔

"سارجنٹ، میں ہلرڈ ہاؤس کا خود جائزہ لے چکا ہوں۔ اس کے مشرقی کونے پر بجلی کا ایک کھمبا ہے۔ صبح ساڑھے چھ بجے دس مزدور اس کھمبے پر کام کر رہے ہوں گے۔ دیکھو، ہشیار آدمی چننا۔ پورے سات بجے دس "مزدور"، ایک نیا کھمبا، ہاتھ گاڑی پر رکھے یہاں پہنچیں گے، پانچ مسلح سپاہی سادہ کپڑوں میں ہلرڈ ہاؤس کی مغربی دیوار کے نیچے ہوں گے اور پانچ شمالی دیوار کے نیچے۔ اس کے علاوہ دونوں طرف ہمسایوں کے ہاں بھی "بجلی درست کرنے والے" پہنچ جانے چاہئیں۔ رات کے تین بجے آپ اس علاقے کے الیکٹرک سٹیشن میں جائیے اور پورے علاقے کی بجلی گل کرا دیجئے۔ چار بجے ہلرڈ ہاؤس کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کی طرف سے شکایات درج ہونی چاہئیں۔ اور چھ بجے مزدوروں کو موقعے پر پہنچ جانا

چاہیئے۔ سادہ لباس میں تیس مسلّح سپاہی چاروں طرف موجود رہیں گے۔ دس راہگیروں کی شکل میں اور باقی اکادُکا اِدھر اُدھر پھرتے رہیں گے۔ ٹھیک سات بجے میں دودھ والا بن کر مکان میں رہوں گا۔ عین اسی وقت کھمبے کے نیچے کھڑے ہوئے پانچ مزدور بھی گھر میں داخل ہوں گے تاکہ روشنی درست کر سکیں۔ اس کے علاوہ پانچ آدمی تیار کرو جو اس وقت ہلرڈ ہاؤس جائیں اور مکان کا جائزہ لے کر کہیں نہ کہیں چھپ جائیں۔ دیکھو، ایک شخص گیراج میں چھپ سکتا ہے۔ دوسرا اسٹور روم میں، تیسرا دوسری منزل کے ان کروں میں جو اکثر خالی رہتے ہیں۔ باقی دو بھی اِدھر اُدھر چھپ جائیں، یہ لوگ مسلّح ہونے چاہئیں۔"

"بہت بہتر جناب۔"

صبح مسز ہلرڈ بستر سے اُٹھی، تو اُس کے جسم میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ کام کرنے کو اس کا جی نہیں چاہتا تھا، لیکن ناشتہ تیار کرنا ضروری تھا۔ اپنے لیے نہ سہی، ان "مہمانوں" کے لیے جو ناشتے میں ذرا سی دیر پر آگ بگولہ ہو جاتے تھے۔ اس نے رالف کو اُٹھایا اور اسے اپنے ساتھ لے کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

اس وقت ہینک اور روبش اوپر خواب گاہ میں سو رہے تھے۔ بندوق ان کے سرہانے رکھی تھی اور گرفن ڈرائنگ روم کے صوفے پر نیم دراز تھا۔ پستول اس کی جیب میں تھا، وہ ابھی ابھی سو کر اُٹھا تھا اور اب نہانے کی سوچ رہا تھا۔

اچانک اُسے باہر کچھ شور سُنائی دیا۔ اس نے کھڑکی کے شیشے میں سے جھانکا۔ آٹھ دس مزدور بجلی کے کھمبے کے پاس کھڑے تھے۔ ایک شخص رسّے کی سیڑھی کے ذریعے کھمبے پر چڑھ رہا تھا۔ اس نے بتی جلا کر دیکھی، تو بجلی غائب تھی۔ اس نے صبح کا اخبار اُٹھایا اور کل والے قتل کی روداد پڑھنے لگا۔ ساڑھے چھ بجے ہلرڈ نیچے آیا۔ گرفن اُسے دیکھتے ہی بولا:

"مسٹر ہلرڈ، ان دونوں بدمعاشوں کو جگاؤ۔ آخر کب تک وہ سوتے رہیں گے؟"

"میں نے جگایا تھا، لیکن روبش بگڑ گیا اور مجھے مار ڈالنے کی دھمکی دی۔"

"عجیب احمق آدمی ہے، خیر سونے دو، اُٹھ کر وہ کونسا قلعہ فتح کر لیں گے۔ ناشتے سے پہلے میں ذرا نہالوں۔" یہ کہہ کر وہ غسل خانے میں گھس گیا۔

ٹھیک سات بجے باہر شور سُنائی دیا۔ گرفن نہا دھو کر کرسی پر بیٹھا بال بنا رہا تھا۔ اس نے باہر جھانکا۔ بہت سے مزدور دو پہیوں والی ایک ہاتھ گاڑی کو دھکیل کر لا رہے تھے جس پر بجلی کا ایک کھمبا رکھا ہوا تھا۔ اچانک دروازہ کھلا اور پانچ سات مزدور ہاتھوں میں اوزار لیے اندر داخل ہوئے۔ ایک نے گرفن سے پوچھا:

"ہین سوچ کہاں ہے؟"

گرفن نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ دروازہ ایک مرتبہ پھر کھلا اور دودھ والا بڑبڑاتا ہوا اندر آیا۔

گرفن اُسے دیکھ کر اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور درشتی سے بولا۔

"کیا بات ہے؟ اندر کیوں گھسے چلے آ رہے ہو؟"

"بھائی صاحب، مجھے آپ یہ بتائیں کہ میں نے آپ کو کب گندا دودھ دیا تھا، آپ کو مجھ سے کیا دشمنی تھی جو آپ نے ایجنسی سے میری شکایت کر دی، یہ دیکھیے"۔ اس نے شکایت نامہ گرفن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

ساتھ ہی اس کی عقابی نظروں نے بھانپ لیا کہ پستول گرفن کی دائیں جیب میں ہے۔ گرفن نے بائیں ہاتھ سے کاغذ کو پکڑا اور اس کا دایاں ہاتھ بدستور جیب میں تھا۔ ابھی وہ کاغذ کی طرف دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ جیسی ویپ اس پر پل پڑا۔ گولی چلنے کی آواز سنائی دی اور بے شمار لوگوں کے قدموں کی آواز جو اس طرف دوڑے چلے آ رہے تھے۔ جیسی کا ہاتھ گرفن کی جیب میں پڑے ہوئے پستول پر تھا اور اسکی گرفت اس پر مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ اگلے ہی لمحے وہ پستول پر قابو پا چکا تھا۔ عین اسی وقت دروازہ کھلا اور چھ سات "مزدور" ہاتھ میں پستول لیے اندر داخل ہوئے۔

"ہاتھ اوپر اُٹھا لو اور پستول پھینک دو"۔

"پستول تو پہلے ہی میرے پاس ہے"۔

تین چار سپاہیوں نے گرفن کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ باقی دس، بارہ جیسی ویپ کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

گولی چلنے کی آواز سے خواب گاہ میں ہینک اور روبش بیدار ہو چکے تھے، لیکن پہلے سے بنائے ہوئے منصوبے کے مطابق ہلرڈ رات کے وقت ان کی بندوق میں سے ساری گولیاں نکال چکا تھا۔ انھوں نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن اتنے بہت سے آدمیوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس تینوں مجرموں کو جیپ میں بٹھائے پولیس سٹیشن کی طرف جا رہی تھی اور ہلرڈ، گھر کے تمام افراد کے ساتھ دروازے میں کھڑا انھیں الوداع کہہ رہا تھا۔

جان شرلاک



بروک اینڈ ڈیونیر سٹریٹ لندن کا ایک نسبتاً خاموش اور غیر معروف حصّہ ہے۔ سیاحوں اور غیر ملکی لوگوں میں نظروں میں یہ جگہ کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں۔ بروک سٹریٹ کے موڑ پر قدیم طرز کی ایک پانچ منزلہ عمارت ہے جس کے صدر دروازے پر سادہ سے حروف میں کلیرج ریسٹورنٹ لکھا ہے۔ یہ عمارت بہت سادہ ہے۔ جگمگاتی روشنیاں ہیں نہ بڑے بڑے شیشوں والے دروازے۔ صدر دروازے پر گہری نیلی وردی میں ملبوس ایک دربان بت بنا کھڑا رہتا ہے۔ کوئی بھولا بھٹکا راہگیر اندر جانے کی کوشش کرے تو استقبال کے بجائے دربان کی بھنویں تن جاتی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ راہگیر کو کچا ہی چبا لے گا۔ ہوٹل کا بار روم بھی خاموش خاموش سا ہے۔ بینڈ والے کہیں دکھائی نہیں دیتے بڑی بڑی آبنوسی میزیں اکثر خالی پڑی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی کسی تقریب پر دھیمی دھیمی موسیقی سنائی دیتی ہے۔ اس ہوٹل کا کھانا بہت عمدہ ہوتا ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ ایسا اچھا کھانا لندن کے کسی ہوٹل میں نہیں ملتا۔ عمارت کے اندر چکا چوند پیدا کرنے والی روشنیاں دکھائی نہیں دیتیں۔ راہ داریاں نیم روشن ہیں۔ فرش پر قدیم طرز کے موٹے قالین بچھے ہیں جن پر چلنے سے ہلکی سی آواز بھی پیدا نہیں ہوتی۔ کمروں کے اندر کا فرنیچر وکٹوریہ کے عہد کا ہے۔ اونچی اونچی زرنگار کرسیاں ہیں۔ بڑے پلنگ، کھڑکیوں پر بھاری پردے، قیمتی مگر پرانا ساز و سامان، اس ہوٹل کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ جدید طرز کے شاندار ہوٹلوں کے مقابلے میں یہ

جگہ نہایت دقیانوسی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ ہوٹل دنیا کے گراں ترین ہوٹلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے باوجود دنیا بھر کے لکھ پتی اور امیر کبیر لوگ اس ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے ترستے ہیں۔ مستقل گاہکوں میں یونان کے شہنشاہ اور ملکہ، نیدرلینڈ کا شہزادہ اور شہزادی، ڈیوک اور ڈچز آف ونڈسر جیسی بڑی بڑی شخصیتیں شامل ہیں۔ اپنی زندگی میں سر ونسٹن چرچل نے بھی کئی بار قیام کیا تھا۔ ملکہ ایلزبتھ کی تاج پوشی پر گیارہ شاہی خاندان کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرے تھے۔ یہ اعزاز دنیا کے صرف اسی ہوٹل کو نصیب ہوا ہے کہ اس کے دروازے پر گیارہ مملکتوں کے پرچم آویزاں تھے۔

کلیرج ریسٹورنٹ میں صرف اُن لوگوں کو کمرہ ملتا ہے جو کسی خاص وجہ سے مشہور و معروف ہوں۔ عام لوگ خواہ کتنے ہی امیر کیوں نہ ہوں یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ ہوٹل میں کمرہ لینے کے لئے پہلے سے درخواست دینا پڑتی ہے۔ ہر درخواست پر انتظامیہ غور و فکر کرتی ہے۔ اور درخواست دہندہ کے خاندان، نام اور معاشرتی حیثیت کو مدّ نظر رکھتے ہوئے فیصلہ دیتی ہے۔ ریسٹورنٹ میں ایک رجسٹر ہے جس میں دنیا بھر کے شاہی خاندان کے نام اور پتے درج ہیں۔ جونہی کسی شہنشاہ یا سربراہ مملکت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا ہے اس کا نام بھی رجسٹر میں لکھ دیا جاتا ہے، دس پندرہ یا بیس سال بعد جب وہ بچہ بڑا ہو کر کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرنے کی خواہش ظاہر کرے گا، انتظامیہ فوراً رجسٹر سے اس کے نام اور پتے کی تحقیق کرے گی۔ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ یہ شخص وہی ہے جس کا بیس سال پہلے نام درج کیا گیا تھا تو انتظامیہ کی طرف سے خوش آمدید کا ایک خط لکھ دیا جائے گا۔ دوسری صورت میں ہوٹل میں ٹھہرنے کے خواہش مند کو مناسب اور موزوں الفاظ میں لکھا ہوا ایک معذرت نامہ بھیج دیا جائے گا۔ دنیا کے مختلف حصوں سے شاہی خاندان کے افراد شہنشاہ، سلطان، نظام، سردار وغیرہ یہاں آ چکے ہیں اور اس الف لیلائی ہوٹل میں ٹھہرتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعے کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا۔ ایک ستائیس سالہ برطانوی فوجی افسر نے دس روز تک مسلسل کوشش کی کہ اُسے نئے سال کی آمد پر ہوٹل کی طرف سے دی جانے والی دعوت میں شمولیت کی اجازت مل جائے لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ آخر اُسے ایک تدبیر سوجھی۔ ایک خط میں اُس کے کمرہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پٹیشا ور پاکستان میں ہے۔ اور وہاں کوئی مہاراجا نہیں۔ لیکن یہ محض شرارت تھی اور وہ ہوٹل کے انتظامیہ کو آزمانا چاہتا تھا۔ اُس کے تعجب

کی کوئی انتہا نہ رہی جب اگلے ہی روز اُسے کلیرج ریسٹورنٹ کی طرف سے "خوش آمدید" کا خط مل گیا اُس نے اپنی ماں کو سفید سلک کی ساڑھی پہنا کر مہارانی بنا دیا۔ خود سوٹ پہن کر ریشمی پگڑی سر پر باندھی۔ دونوں نے اپنے چہرے سیاہ کئے۔ "آنریبل پرنس آف پشاور" اور مہارانی آف پشاور" نے دو دن کلیرج میں شاہانہ ٹھاٹھ باٹ سے گذارے۔ نئے سال کی خوشی میں دی جانے والی دعوت میں شرکت کی اور گھر لوٹ آئے۔ بعد میں جب ہوٹل کی انتظامیہ کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو منیجر پر بڑی لے دے ہوئی۔

کلیرج ریسٹورنٹ میں عمارت میں لفٹ، جوتے پالش کرنے والی مشین اور دوسری جدید سہولتیں نہیں ہیں۔ سارا کام ملازم اپنے ہاتھ سے انجام دیتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ٹھہرنے والے اپنے آپ کو چودھویں یا پندرھویں صدی کے شہنشاہ محسوس کرتے ہیں جن کے ایک اشارے پر کئی کئی ملازم حاضر ہو جاتے تھے۔ ہوٹل میں زیادہ سے زیادہ ۲۸۰ مہمان ٹھہر سکتے تھے۔ گو اکثر کمرے خالی رہتے ہیں۔ پھر بھی یہاں مہمانوں کی خدمت کے لئے پانچ سو سے زائد ملازم ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ ہوٹل کا ماحول ایک عام ریسٹورنٹ کے بجائے پرائیوٹ کلب سے زیادہ مشابہ ہے۔ غیر متعلق لوگوں کو اندر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ یہ مضمون لکھنے کے لئے میں نے ہوٹل کی انتظامیہ سے کئی مرتبہ درخواست کی تب کہیں جا کر مجھے اجازت ملی اور وہ بھی اس طرح کہ مجلس منتظمہ کا ایک اجلاس بلایا گیا۔ تین دن بحث جاری رہی اور آخر چوتھے روز فیصلہ ہوا کہ اجازت دے دی جائے۔

کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرنے کے لئے ہر شخص کو ۱۵۰ ڈالر روزانہ ادا کرنے پڑتے ہیں۔ یہ صرف کمرے کا کرایہ ہے۔ اس میں کھانے کا خرچ، بیروں کی ٹپ اور دوسرے متفرق اخراجات شامل نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اتنا کرایہ صرف شاہی خاندان کے افراد عمائدینِ مملکت یا لکھ پتی اشخاص ہی ادا کر سکتے ہیں۔ تاہم کرایہ کی یہ شرح قطعی نہیں ہے۔ بس یوں سمجھئے کہ اگر ایک بار ہوٹل کے رجسٹر میں آپ کا نام لکھا گیا تو جب کبھی آپ ٹھہرنا چاہیں آپ بخوشی ٹھہر سکتے ہیں خواہ آپ مقررہ کرایہ ادا کرنے کے قابل ہوں یا نہ ہوں۔ ہالی وڈ کا مصنّف اور فلم سٹار ایڈون ناپ بچپن میں اپنی والدہ کے ساتھ ٹھہرا کرتا تھا۔ پچھلے دنوں وہ لندن آیا اور ایک دوسرے ہوٹل میں ٹھہرا۔ اتفاق سے اُسے کلیرج ریسٹورنٹ کا منیجر مل گیا۔

"مسٹر ناپ آپ ہمارے یہاں مہمان ہیں۔ آخر آپ دوسرے ہوٹل میں کیوں ٹھہرے؟"

"سچی بات یہ ہے کہ میں ۱۵۰ ڈالر یومیہ ادا نہیں کر سکتا۔ اور وہ بھی کھانے کے علاوہ۔ میں جس کمرے میں ٹھہرا ہوں، اس کا یومیہ کرایہ صرف دو ڈالر ہے۔

"کچھ بھی ہو۔ کلیرج کے مہمان اگر دوسرے ہوٹل میں ٹھہرنے لگیں تو یہ کلیرج کی سبکی ہے اور اس کے مہمانوں کی بھی ۔۔۔ آپ کا نام ہمارے یہاں مہمانوں کی فہرست میں درج ہے۔ آپ یہیں ٹھہرئیے میں ابھی فون کرکے مجلس انتظامیہ کے صدر سے اس مسئلے کا حل دریافت کرتا ہوں!"

یہ کہہ کر منیجر اُٹھا اور فون کرنے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ لوٹا اور ایڈورن ناپ سے مخاطب ہو کر بولا۔

آپ کلیرج تشریف لے چلئے۔ میں آپ کا سامان منگواتا ہوں۔ کرایہ کی فکر مت کیجئے۔ جتنا کرایہ آپ یہاں ادا کر رہے ہیں، وہی ہمیں دے دیجئے گا۔"

دوسرے ملکوں سے آنے والے مہمانوں کی پذیرائی کے لئے کلیرج ریسٹورنٹ خاص انتظامات کرتا ہے۔ بندرگاہ پر "خوش آمدید" کہنے کے لئے دو اشخاص موجود رہتے ہیں جو مہمان کو بڑی عزت وتکریم سے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ جہاز سے ساحل تک پہنچنے کے لئے اعلیٰ درجے کی ایک مخصوص موٹر بوٹ کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ گاڑی میں بھی پہلے سے نشستیں محفوظ ہوتی ہیں۔ جونہی معزز مہمان ہوٹل کے دروازے پر پہنچتا ہے۔ دربان ایک بٹن دباتا ہے جس سے منیجر کے کمرے میں لگا ہوا ایک سبز بلب جل اُٹھتا ہے۔ منیجر فوراً اپنے اسٹاف کے ساتھ باہر آتا ہے تاکہ مہمان کو پورے شاہی مراسم کے ساتھ کمرے تک پہنچائے۔ تشریف آوری کی طرح ہر مہمان کی رخصتی بھی بڑا دلچسپ منظر پیش کرتی ہے۔ متعلقہ کلرک ایک بٹن دبا کر منیجر کو کسی مہمان کے رخصت ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ منیجر اپنے ملازموں کی معیت میں نکلتا ہے اور مہمان کو دروازے تک چھوڑنے جاتا ہے

یہاں اکثر ملازم عمر رسیدہ ہیں اور دس دس، پندرہ پندرہ سال سے مہمانوں کی خدمت میں مصروف ہیں۔ سب ملازم بہت سنجیدہ اور باوقار ہیں۔ قدیم وضع کی ٹوپیاں پہنتے ہیں جن پر سنہری بیل بوٹے بنے ہوتے ہیں۔ دبے پاؤں چلتے ہیں اور سر جھکا کر بڑے ادب سے بات کرتے ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق، کھیل کود یا زور سے بات کرنا منع ہے۔ مزے کی بات یہ کہ یہاں کام کرنے والے کو بہت معمولی تنخواہیں ملتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ہفتے وار تنخواہ ۱۴ ڈالر ہے۔ حالانکہ دوسرے اچھے ہوٹلوں میں ڈیسک کلرک بھی ۲۵ ڈالر سے ۳۵ ڈالر تک تنخواہ وصول کرتے ہیں۔ پھر بھی کلیرج ریسٹورنٹ میں کام کرنا لوگ فخر سمجھتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ یہاں دنیا کے مشہور ومعروف لوگ آکر ٹھہرتے ہیں اور یہاں کا ماحول عجب پراسرار سا ہے۔ ہر ملازم کو ہفتے کے آخری دن جو رقم ملتی ہے اس سے کہیں زیادہ وہ ٹپ کے طور پر وصول

کرتا ہے جو سب ملازم ایک جگہ جمع کرتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ آپ کے طور پر دی جانے والی تمام رقوم جمع کر لی جاتی ہیں۔ ہر ہفتہ سب ملازم اُسے مساوی طور پر آپس میں تقسیم کر لیتے ہیں

کلیرج ریسٹورنٹ اپنے مہمانوں کی خواہش پر ہر چیز مہیا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایک بارمین کے شہزادے نے تقاضا کیا کہ اُسے فوراً ہی بھیڑ کا بھنا ہوا گوشت چاہیئے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ بھیڑ کو اُس کا ذاتی ملازم ذبح کرے گا۔ اور وہی اُسے پکائے گا۔ چنانچہ آدھی رات کے وقت ایک بھیڑ منگوائی گئی۔ شہزادے کے باورچی نے اُسے ذبح کرکے پکایا اور صرف آدھ گھنٹے میں شہزادے کے سامنے بھنا ہوا گوشت پیش کر دیا گیا۔

روس کے سابق سربراہ مسٹر خروشیف بھی کلیرج ریسٹورنٹ کے مہمان رہے ہیں۔ صبح کے تین بجے تھے کہ اُس نے دیگچی کی فرمائش کی۔ اتفاق سے ہوٹل کے باورچی خانے میں اُس وقت کوئی ایسی دیگچی نہ تھی جو خروشیف کے بتائے ہوئے معیار پر پوری اُتر سکے۔ چنانچہ بازار سے دیگچی منگوائی گئی۔ اس دوران میں خروشیف سخت بے چینی کے عالم میں راہداری کے چکر کاٹتا رہا۔ جب دیگچی اُس کے حضور میں پیش کی گئی تو اُس نے اپنے سکورٹی افسر کو طلب کیا۔ اچھی طرح یہ اطمینان کر لینے کے بعد کہ دیگچی صاف حالت میں ہے اور اس میں کوئی چھوٹا مائیکروفون نہیں چھپایا گیا ہے، خروشیف نے دیگچی لے لی اور کمرے میں چلا گیا۔ میرے بار بار پوچھنے پر بھی ہوٹل کے منیجر نے یہ بتانے سے انکار کر دیا کہ خروشیف نے دیگچی کیوں مانگی تھی۔

"یہ اُن کا ذاتی مسئلہ تھا اور ہم اپنے مہمانوں کے ذاتی افعال کو کسی کے سامنے بیان نہیں کرتے"

جو لوگ پہلے پہل کلیرج ریسٹورنٹ میں ٹھہرتے ہیں وہ یہاں کے ماحول سے بہت مرعوب ہوتے ہیں۔ اکثر تو طعام گاہ یا بار روم میں نظریں جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ احساس کہ دنیا کے بڑے بڑے لوگ دیکھ رہے ہیں، انھیں پریشان کر دیتا ہے۔ بعض مہمانوں کو ناپسندیدہ حرکات کی بنا پر تنبیہہ کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر مسٹر بنگ کراسبی کو ریسٹورنٹ کی بالائی چھت پر گولف کھیلتے ہوئے دیکھا گیا۔ انتظامیہ نے فوراً اُس کے نام نوٹس جاری کر دیا۔ دوسری مرتبہ جب مسٹر بنگ نے ہوٹل میں کمرہ لینے کی خواہش ظاہر کی تو اُسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آرسن ویلز نے ریسٹورنٹ پر ایک دستاویزی فلم تیار کرنے کی اجازت چاہی لیکن انتظامیہ نے سختی سے انکار کر دیا۔

کلیرج میں دی جانے والی دعوتیں بہت پرتکلف ہوتی ہیں۔ حاضرین کی تعداد تین چار سو سے کبھی زائد نہیں ہوتی۔ گزشتہ بیس سالوں میں سب سے بڑی دعوت ۱۹۵۶ء میں دی گئی میزبان خروشیف اور مارشل بلگانن تھے اس دعوت میں ۱۵۰۰ مہمان شریک ہوئے۔ اس موقعہ پر پہلی مرتبہ بار روم، طعام گاہ اور ہال کمرہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا دکھائی دیا۔

کلیرج ریسٹورنٹ کے ملازم بہت وفادار اور محنتی ثابت ہوئے ہیں۔ سالہا سال کام کرنے کی وجہ سے انھیں ریسٹورنٹ سے ایک خاص عقیدت ہو جاتی ہے۔ چنانچہ مسٹر ایلس برنز کلیرج میں فرش صاف کرتی تھی۔ یہ خاتون لندن کے علاقے برمونڈسی کی میر منتخب ہو گئی۔ اس عہدے پر فائز ہو جانے کے بعد بھی وہ ہر شام بڑی باقاعدگی سے اپنی شاندار رولز رائس گاڑی میں وقت مقررہ پر پہنچ جاتی اور دو گھنٹے تک راہداری کے فرش کو جھاڑن سے اچھی طرح صاف کرتی ہوٹل میں کام کرنے والے کی خدمت کے لئے بھی چند ملازم رکھے گئے ہیں جو اسٹاف کی ذاتی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ ان کے لئے کھانا پکاتے ہیں کپڑے استری کرتے ہیں اور جوتے چمکاتے ہیں

اس ریسٹورنٹ میں ٹھہرنے والے بیشتر لوگ چونکہ کسی نہ کسی لحاظ سے منفرد اور ممتاز حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اس لئے ظاہر ہے کہ اخباری نمائندوں اور شوقیہ ملنے والوں کی ایک بڑی تعداد ان تک پہنچنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے۔ ہوٹل کی انتظامیہ نے مہمانوں کے آرام کی خاطر ملاقاتیوں پر آمد پر پابندی عائد کر دی ہے۔ صرف وہ لوگ یہاں آ سکتے ہیں جن کے لئے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے اشخاص خود سفارش کریں۔ گفتگو کے دوران میں میں نے منیجر سے پوچھا۔

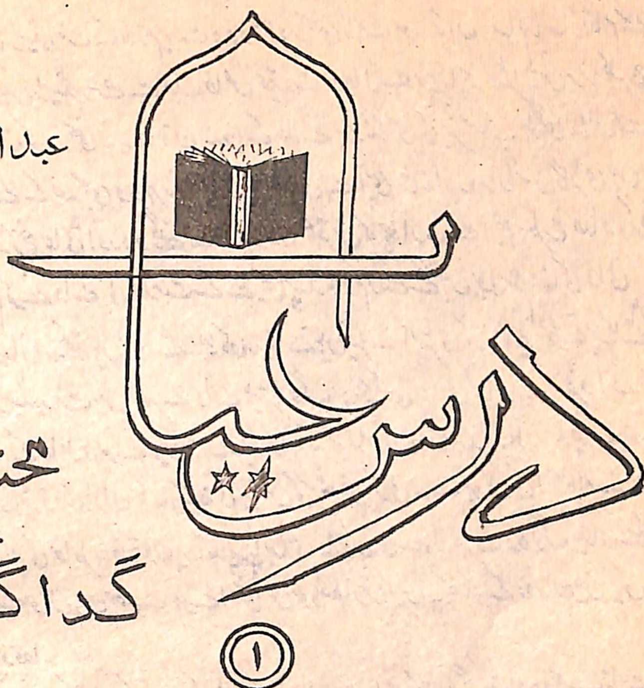
"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ہاں آنے والوں میں سے کون لوگ زیادہ دلچسپ ثابت ہوتے ہیں؟"

"میں کسی فرد کا نام نہیں لوں گا کیوں کہ یہ ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ بہر حال مجموعی طور پر میرا تاثر یہ ہے کہ امریکی نو دولتیے یہاں آ کر اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ بے چاروں کے منہ سے بات نہیں نکلتی۔ وہ چیختے چلاتے ہوٹلوں میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہاں کے باوقار ماحول اور پراسرار گمبھیرتا میں وہ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ ایک امریکی سرمایہ دار نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہاں صرف اس لئے ٹھہرتا ہے کہ اُسے خوف زدہ ہونے میں بڑا لطف آتا ہے۔

ملازموں کو انتظامیہ کی طرف سے خاص ہدایات ہیں کہ وہ ہر حالت میں مہمانوں سے عزت و احترام سے پیش آئیں۔ ایک بار چند معزز مہمان کھانا کھا رہے تھے۔ دستر خوان پر بھنی ہوئی سالم مچھلی بھی تھی۔ ایک صاحب نے گوشت کھا کر سالم پنجر ایک طرف رکھ دیا۔ عین اُسی وقت بیرا پانی لے کر آیا۔ اُن صاحب کو دل لگی سوجھی اُنھوں نے بیرے کو بلایا اور مچھلی کا پنجر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا، "یہ لو تمہارا انعام!"

بیرے نے شوربے سے لتھڑا ہوا پنجر اپنی صاف ستھری قمیص کی جیب میں رکھا اور جھک کر نہایت احترام سے بولا۔ "جناب میں اس عنایت کے لئے آپ کا مشکور ہوں!"

عبدالقدوس رومی



محنت یا گداگری

(۱)

حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا اور اپنی تنگدستی کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔

"یا رسول اللہ! میں آپ کی خدمت میں ایسے وقت حاضر ہوا ہوں کہ گھر واپس جانے کے بعد گھر کے بعض لوگوں کو بھوک سے مرا ہوا دیکھوں گا۔"

آپ نے ارشاد فرمایا۔

"جاؤ جو کچھ تمہارے پاس ہو لے آؤ!"

وہ چلا گیا اور ذرا دیر بعد ایک چادر اور ایک پیالہ لے کر آیا اور بولا۔

"یا رسول اللہ! یہ ایک بڑی سی چادر ہے جس کا کچھ حصہ ہم بچھاتے تھے اور کچھ اوڑھتے تھے اور یہ پیالہ ہے جس میں ہم پانی پیتے تھے"

آپ نے حاضرین صحابہ کرام کو مخاطب کر کے دریافت فرمایا۔

"یہ دونوں چیزیں ایک درہم میں کون لے گا؟"

"میں لوں گا" حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا

کوئی ایک درہم سے زیادہ بھی دینے کو تیار ہے؟ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت

فرمایا۔

"میں دو درہم دوں گا" ایک دوسرے شخص نے دام لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ دونوں چیزیں تمہاری ہوگئیں" آپ نے نیلام کو ختم کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

پھر آپ نے اس آدمی کو بلایا جسکی یہ دونوں چیزیں آپ نے نیلام فرمائی تھیں اور اسکو کچھ کام کرنے کی نصیحت فرمائی اس نے کچھ چھوٹا موٹا کام کیا اور ان دو درہموں سے دس درہم کمائے پھر وہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا۔

"یارسول اللہ! اللہ تعالےٰ نے مجھے برکت دی"

آپ نے فرمایا۔

"یہ تمہارا محنت مزدوری کر کے کھانا اس سے بہتر ہے کہ تم قیامت کے دن فقیر بن کر پیش ہوتے" ایک دوسرے موقع پر آپ نے گداگری کی پستی اس طرح ظاہر فرمائی یعنی ارشاد فرمایا۔

"اونچا ہاتھ نیچے ہاتھ سے بہتر ہے" یعنی دینے والے کا ہاتھ جو اوپر کو ہوتا ہے وہ لینے والے کے ہاتھ سے بہتر ہے جو نیچے کی طرف ہوتا ہے۔



ایک صاحب ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ۔

ایک مرتبہ میرے سامنے ایک فقیر آیا اس نے مجھ سے سوال کیا میں نے اسکو ایک روپیہ دیدیا سامنے ہی ایک اور آدمی کھڑا تھا اس نے اس فقیر سے کہا۔

"میاں! یہ بھیک کی ذلت گوارا کرتے تمہیں شرم نہیں آئی، اگر مانو تو ایسی ترکیب بتاؤں کہ لکھ پتی ہوجاؤ!

اس شخص کی یہ بات سن کر مجھے بھی ہنسی آگئی اور وہ فقیر بھی ہنس پڑا اس آدمی نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

آپ دونوں شاید اس لئے ہنس رہے ہیں کہ میری بات آپ کے نزدیک قابل یقین نہیں ہے؟ اس کے سوال کا ابھی ہم کچھ جواب دینے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے کہنا شروع کیا۔

ایک زمانہ تھا کہ میں بھی بھیک مانگا کرتا تھا اور راستہ چلنے والوں کے دامن پکڑ کر ان سے

خیرات طلب کیا کرتا تھا لیکن بھیک کی ذلت مجھے طبعی طور پر ناگوار تھی چنانچہ میرے پاس جب کچھ روپے جمع ہو گئے تو میں نے پرانے کپڑوں کا بیوپار شروع کر دیا احتیاط کی زندگی بسر کرتا، کماتا بھی کھاتا بھی اور جمع بھی کرتا! نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ میرا کاروبار چمک اٹھا اور اب خدا کے فضل سے اپنے وطن کے چند چوٹی کے سرمایہ داروں میں سے ایک میں بھی ہوں۔"

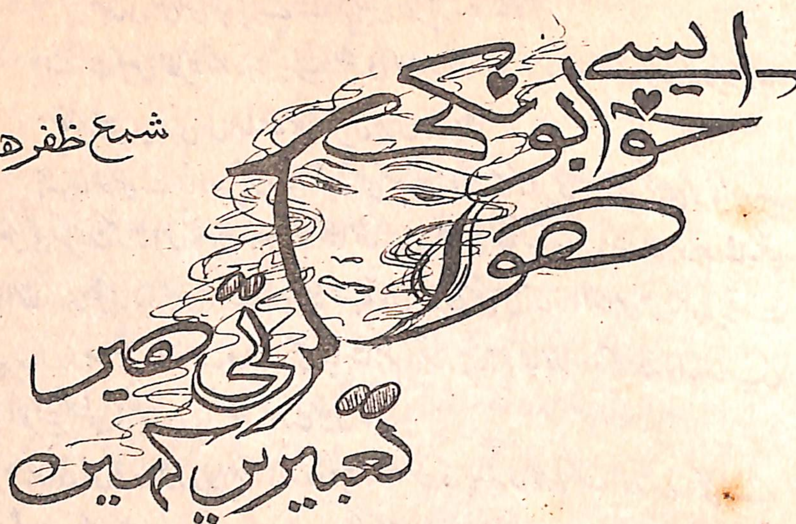
وہ شخص تو اپنی یہ کہانی سنا کر چلا گیا مگر میں نے دیکھا کہ وہ فقیر جسے میں نے ابھی روپیہ دیا تھا اپنی جگہ پر چپ چاپ کھڑا کچھ سوچ رہا ہے میں نے اسکی طرف کچھ زیادہ توجہ نہ کی اور اپنا راستہ لیا۔

اس واقعہ کو بیس سال گذر گئے!

ایک مرتبہ ایک دور دراز شہر میں مجھے جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز کسی ضرورت سے ایک بڑی دوکان میں داخل ہوا جسکی مالیت لاکھوں روپیوں کی رہی ہوگی۔ مالک کی جگہ پر جو شخص بیٹھا تھا اسے دیکھتے ہی خیال ہوا کہ اسے میں نے کہیں ضرور دیکھا ہے وہ بھی مجھے ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ میری اسکی جان پہچان کہاں کی ہے، تھوڑی دیر میں ہم نے ایک دوسرے کو پہچان لیا اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔"

یہ بتانے کی ضرورت نہ ہوگی کہ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے ایک دن ایک روپیہ دیا تھا ہم دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں اس نے بتایا کہ کس طرح وہ اس مرد بزرگ کی باتوں سے متاثر ہوا پھر تھوڑا بہت روپیہ بچا کر اس نئے شہر میں کاروبار کی بنیاد ڈالدی بالآخر خدا تعالے نے کامیاب کیا اسلئے کہ

"کوئی عمل رائیگاں نہیں جاتا۔"



شمع ظفر ھندی

دلہن کی موٹر ایک لطیف ہچکولہ لے کر آگے بڑھ گئی۔ پورٹیکو سے لے کر گیٹ تک سرخ بجری پڑی روش پر پھول بکھرتے چلے گئے۔ رنگ و نکہت کا کارواں گذر گیا۔ باہری برآمدے میں کھڑی ہوئی لڑکیاں اور عورتیں واپس اندر جانے لگیں۔ نجمہ ایک ستون کو تھامے ابھی تک اس رہ گذر کو دیکھے جا رہی تھی جس پر سے ہو کر روبینہ بیگم پی کے دیس سدھاری تھیں۔

"اے ہے نجو اندر آؤ بیسوں کام پڑے ہیں اور تم ابھی تک وہیں کھڑی ہو" کسی نے آواز دی اور وہ چونک کر اندر چلی گئی۔

گھر کے اندر ابھی تک وہی گہما گہمی تھی۔ روبینہ بیگم کے کالج کی سہیلیاں اور چھوٹی صاحبزادی رباب بیگم کی سہیلیاں، کنبے کی اور بہت سی شوخ لڑکیاں چائے کی میز کے گرد بیٹھی ابھی تک روبینہ کی سسرال سے آئے ہوئے سامان اور لوگوں پر تبصرہ کر رہی تھیں۔ کوئی روبینہ کو یاد کر رہی تھی تو کوئی دولہا کی تعریف میں قصیدے کہے ڈال رہی تھی۔

"ہائے روبینہ باجی دولہن بن کر کس قدر حسین لگ رہی تھیں بالکل جیسے مغل اعظم میں انارکلی!"

"ان کی آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں جیسے موتی کچل کر بھر دیئے گئے ہوں۔"

"دولہا بھائی بھی کافی ہینڈسم ہیں!"

"مجھے تو وہ بالکل پریوں کی شہزادی لگ رہی تھیں!"

بھائی بھی کسی شہزادے سے کم نہیں نظر آرہے تھے۔"

"اے ہے کہیں نظر نہ لگا دینا میرے بہنوئی کو۔" رباب نے شوخی سے اپنی سہیلی کو دیکھ کر کہا۔
"تمھیں بھی ایسا ہی مل جائے گا گھبراتی کیوں ہو؟"

نجمہ خاموشی سے چاء سرو کر رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی بات پر مسکرا دیتی تھی۔ جب کبھی کوئی روبینہ کے حسن کی تعریف کرتا اس کا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ یہ بالکل سچ تھا کہ وہ روبینہ سے ہو بہو مشابہ تھی۔ وہی ماتھا، وہی چمکدار آنکھیں، ویسے ہی گھنے لانبے بال، وہی میٹھی سی آواز، اتنا ہی قد۔ اب یہ قسمت کا پھیر تھا کہ روبینہ بیگم نے نواب صاحب کی بیاہتا بیگم کی گود میں جنم لیا تھا اور نجمہ نے نواب صاحب کی منظورِ نظر کنیز گلشن کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں۔

جوانی آئی تو دونوں ہی پر آئی۔ روبینہ کے حسن کی چاندنی کالج کلب اور سوسائٹی کے اونچے گھرانوں تک پھیل رہی تھی۔ نجمہ کا حسن میلے کپڑوں میں چھپانے پر بھی شاگرد پیشہ کی سیلی دیواروں اور باورچی خانے کی سیاہیوں میں چمک چمک جاتا تھا۔

نواب صاحب کے بچوں سے گھر بھرا پڑا تھا۔ انھیں کبھی ضرورت نہ محسوس ہوتی کہ ایک شفقت کی نگاہ سے ہی اُس کو نواز دیتے اور اتنی اخلاقی جرأت تو ان سے بہت بعید تھی کہ وہ نجمہ کو اپنے اور بچوں کے برابر جگہ دے سکتے۔

نجمہ کبھی کبھی اُن سب بچوں کو آپس میں لڑتا جھگڑتا دیکھتی یا پیار کی چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھتی تو بے اختیار سوچتی کاش وہ بھی اس میں حصّہ لے سکتی۔ رباب کی طرح بھائی جان کہہ کر کبھی وہ بھی بڑے بھیا کے گلے میں جھول جاتی۔۔۔۔ آخر کو تو وہ اُس کے بہن بھائی ہی تھے مگر اُس کی حیثیت کیا تھی۔

"او نجو ایک گلاس پانی۔۔۔" بڑے بھیا کی آواز سُن کر وہ دوڑ پڑتی۔
"بھئی نجمہ وہ میرا دوپٹہ جس میں تمھیں کرن ٹانکنے کو دی تھی پورا ہو گیا؟" رباب پوچھتی۔
"نجو شام کے کھانے میں ہم شامی کباب کھائیں گے۔" چھوٹے بھیا ہمیشہ ہی کھانے پینے کے شوقین تھے۔

اور وہ سارے کام اتنے شوق اور لگن سے کرتی، اس امید میں کہ شاید کبھی کوئی پیار سے اُس سے بات کرے۔ مگر اپنا کام کروا لینے کے بعد پھر کسی کو اُس کی طرف دیکھنے کی بھی فرصت نہیں تھی۔
نواب صاحب کا انتقال ہوا تو سارا کنبہ اکٹھا تھا۔ بڑے ہال میں میت رکھی تھی۔ بیگم صاحبہ

روبینہ، رباب اور تمام قریبی اعزا گھیرے کھڑے تھے۔ نجمہ بہت دور کھڑی باپ کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ وہ باپ جس نے اُس کو کبھی بیٹی نہ سمجھا تھا۔ مگر خون کی محبت بھی کیا شے ہے، نجمہ اِس طرح بیقرار ہو کر بلک رہی تھی جیسے نواب صاحب نے اُسے باپ کی محبت سے پالا ہو۔

نواب صاحب کی بہن نے اپنی لال انگارہ سی آنکھوں کو ڈوپٹے سے پونچھ کر اُدھر دیکھا۔

"اے نجو نامراد دیکھتی نہیں رباب کے دشمنوں کو غش آگیا ہے جلدی ٹھنڈا پانی اور گلاب پاش لا.... اور سُن باہر سے بڑے بھیا کو بلاتی لانا۔ ۔ اے میں صدقے میری بچی۔" انھوں نے نیم بیہوش سی رباب کو اپنی گود میں لٹا لیا۔

تھرتھراتی پنڈلیوں کے ساتھ نجمہ پانی کا گلاس اور گلاب پاش لئے آئی تو جنازہ اُٹھ رہا تھا۔ اُس کی نگاہ کھُلے ہوئے چہرے پر جم کر رہ گئی۔ گلاس چھوٹ کر فرش پر گر گیا اور خود لڑکھڑا کر بیگم صاحبہ کے زانو سے ٹکراتی ہوئی تڑاق سے نیچے گری۔

بیگم صاحبہ نے روتے روتے سر اُٹھا کر گرنے والی کو دیکھا پھر اپنا زانو سمیٹ لیا۔

پھوپھی بیگم رباب کو سنبھالتے سنبھالتے بولیں ـــــ "اے لو رباب بیہوش ہوئی تھی وہ کیسے نہ ہوتیں۔ معلوم کیسے ہوتا کہ اُن کو بھی باپ کا صدمہ ہے۔ خدا کی مار ایسی اولاد پر۔" انھوں نے نجمہ کا سر زانو کے نیچے سے ڈھلکا کر چاندنی پر کر دیا۔

بڑے بھیا کے بیاہ میں نجو نے دن رات ایک کر دیئے۔ ہر کام اپنے ہی سر لئے لیتی تھی۔ دلہن بیاہ کر آئی تو نجو بھی جا کر پاس بیٹھ گئی۔ کسی کام سے اُٹھا دیا گیا۔ اِدھر اُدھر سے آئی پھر بیٹھ گئی۔ بھابھی کہنے کی تمنا تھی۔ ایک بار بھابھی کہا ہی تھا کہ بیگم صاحبہ کے کڑے تیوروں سے دیکھ کر کہا "کیا دلہن پر اپنا نندپن جتانا ہے خبردار جو بھابھی کہا۔ دلہن بیگم کہا کر۔ نجمہ روہانسی سی اُٹھ گئی۔ اپنی کوٹھری میں جا کر گھنٹوں روتی رہی۔

یہ سب اُس کے ہیں مگر اس کا کوئی نہیں۔ اُس کا گناہ کیا ہے؟ کبھی کبھی اُسے اپنی ماں پر غصہ آتا۔ کبھی نواب صاحب کے لئے دل میں نفرت کا لاوا سا اُبلتا مگر سارے بہن بھائیوں کے لئے اُس کے دل میں گہری محبت تھی۔ کیا ہوا جو اُن لوگوں نے کبھی اُسے بہن کا درجہ نہیں دیا۔ وہ تو لاکھ جانوں سے اُن پر نثار رہتی تھی۔ جب سے روبینہ کی شادی ہوئی تھی وہ اپنے بارے میں سوچا کرتی تھی۔ روبینہ کو دلہن بنا ہوا دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے وہ خود دلہن بن گئی ہو۔ دلہن بننے کا یہ سپنا اُس کے دل میں سما کر رہ گیا تھا۔ راتوں کو سب کام ختم کرنے کے بعد وہ گھنٹوں سوچا کرتی۔ کیا کبھی اُس کو لینے

بھی کوئی آئے گا، پھولوں سے سجی ہوئی موٹر، شہزادوں جیسی صورت والا دولہا۔ مگر پھر وہ اپنی حیثیت سوچ کر کانپ جاتی۔ نوکروں میں کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اس کو بُری نگاہ سے دیکھ بھی سکتا۔ اُس کا چہرہ اتنا پُر وقار تھا کہ سرونٹ کوارٹرز میں رہ کر بھی وہ اُن سب سے جُدا تھی۔ بڑے بھیّا کے دوستوں نے اکثر اُس کو دلچسپی سے دیکھا تھا مگر آج تک کسی کی نگاہ میں اُسے اپنے اپنائے جانے کا خیال نظر نہیں آیا۔ اُسے کون اپنائے گا۔ وہ کیسی لڑکی ہے؟ یہ تو سب ہی جانتے ہیں۔ مگر خوابوں پر بھی کبھی کوئی دلیل اثر کرتی ہے۔ وہ سوتے جاگتے رنگین سپنوں میں کھوئی کھوئی رہنے لگی۔ شاید یہ عمر کا تقاضہ تھا۔

رباب کی شادی میں بھی اُس نے تصور میں اپنے آپ کو دلہن بنتے دیکھا۔ رباب کے مہندی رچے پاؤں جب دھیرے دھیرے بابل کا آنگن چھوڑ رہے تھے تو اُس نے اپنے گرد آلود پیروں کو دیکھ کر بار بار سوچا کبھی تو ان پر بھی یہ رنگ سجے گا۔ کبھی تو یہ بھی وفورِ شوق سے اسی طرح تھرا کر بڑھیں گے۔

وقت پر لگائے اُڑا چلا جاتا ہے۔ اُسے خبر بھی نہ ہوئی کب گھنیری کالی زلفوں میں سفیدی کی افشاں جگمگائی۔ کب چہرے سے جوانی کی تمازت معدوم ہونا شروع ہوئی۔ کس لمحے آنکھوں کا جادو پھیکا پڑنے لگا۔ وہ تو ابھی کسی اچانک ہو جانے والے خوشگوار حادثے کی منتظر تھی۔

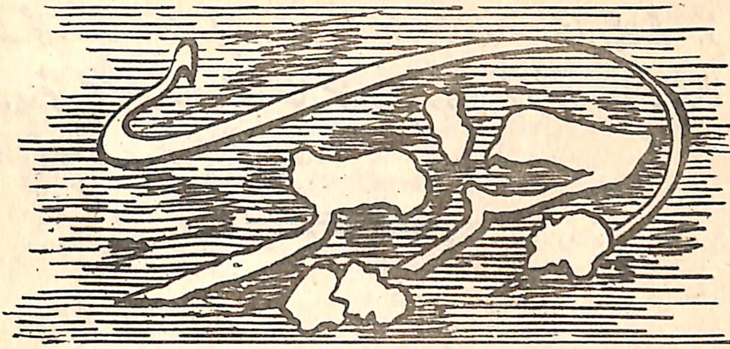
روبینہ اور رباب جب کبھی آتیں اُن کے پھول سے بچوں کو نجمہ کلیجے سے لگا لیتی۔ نہلا دھلا کر پوڈر لگا کر جب کبھی وہ کسی بچے کو پیار کرتی تو ایک انوکھی لذت اُس کی رگ رگ میں دوڑ جاتی۔ آنکھوں میں خوابوں کے سائے اور گہرے ہو جاتے۔

ایک چھوٹا سا آنگن ہوگا جس میں وہ سفید گلاب اور چمیلی کی بیل لگائے گی۔ اُسے یہی پیارے پیارے بچے اس آنگن میں بھی کھیلیں گے۔ دو مضبوط سہارا دینے والے ہاتھ اُسے ضرور اس خلار سے نکال کر لے جائیں گے۔ اُس کا اپنا گھر ہوگا، اپنا شوہر، اپنے بچے۔ اس کا بھی کسی سے کوئی رشتہ ناطہ ہوگا۔ اُسے بھی کوئی اپنا کہے گا۔

مگر کب؟ یہ انتظار کی حدیں کبھی ختم بھی ہوں گی۔ بڑے بھیّا کی سب سے بڑی صاحبزادی رخسانہ بیگم کی شادی اِس گھر سے ہو رہی تھی۔ نجمہ حسب معمول ہر کام میں سب سے آگے آگے۔ ایک پیر اندر رکھتا تو ایک باہر۔ ۔ ۔ پھولوں سے سجی موٹر گیٹ سے اندر آئی دیکھ کر وہ رک گئی۔ ۔ ۔ کسی نے دلہن کے کپڑوں کی کشتی اُس کے ہاتھ میں تھما دی تو وہ دلہن کے کمرے میں تھی۔ سامنے

قد آدم آئینے میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت کو آنکھوں میں جوانی کے خواب سجائے دیکھ کر وہ چونک گئی ۔۔۔۔۔۔ انتظار کی حدیں ۔۔۔۔۔۔ ایک چھنّا کا ہوا سب مُڑ کر دیکھنے لگے ۔ نجّو فرش پر بیٹھی نیچے گرا ہوا سامان اُٹھا اُٹھا کر کشتی میں رکھ رہی تھی ۔ مگر آنکھوں سے ٹوٹ کر گِر جانے والا زندگی کا سب سے رنگین سپنا بکھر چکا تھا ۔





نصیر زبیری

نواب یار خاں سے کون واقف نہیں ہے ؟ ــــ مسجد چراغ دین کے پچھواڑے سوکھے تالاب میں اتر جائیے، گندی اور گری پڑی افلاس زدہ جھونپڑیوں کی بکھری پڑی آبادی میں کسی بچے ہی سے پوچھ لیجئے وہ انگلی پکڑکے آپ کو نواب صاحب کے گھر پہنچا آئے گا۔ دروازے پر دستک نہ دیجئے گا، نواب صاحب ناراض ہو جائیں گے۔ وہ اصولوں کے بڑے پابند ہیں ــــ ہلکے سے تالی بجائیے ــــ مبادا محوِ خواب ہوں اور نیند جھٹکے سے ٹوٹ جائے ــــ اس حرکت سے نواب صاحب کی طبیعت کئی دن کے لئے خراب ہو جاتی ہے ــــ یا نرم آواز میں پکارئے ــــ

"نواب ــــ صاحب"

آہستہ سے دروازہ کھلے گا ــــ اور چلمن کے پیچھے سے دو آنکھیں آپ کا تفصیلی جائزہ لیں گی۔

نواب صاحب کا مکان ساری آبادی میں ایک ممتاز اور نمایاں حیثیت کا حامل ہے ــــ نسبتاً زیادہ کشادہ اور آبادی کے دوسرے گھروں کی طرح "ٹراٹے" کی تیلیوں کی بجائے ٹٹیوں کا بنا ہوا جو جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی ہیں چھت تھوڑی سی ٹین کی ہے، کچھ کھپریل اور باقی گھاس کی ــــ اس محل میں نواب صاحب برسوں سے رہتے ہیں۔

نواب یار خاں کون ہیں؟ — ان کا یہ عجیب وغریب خطاب کس کا عطا کیا ہوا ہے؟ موصوف اگر جاگیر دار ہیں تو ان کی ریاست کہاں ہے؟ — یہ سب ایسے سوالات ہیں جن کو نواب یار خاں نے اپنے گھر کے کسی خفیہ کونے میں دفن کر کے ان پر راز کی منوں مٹی ڈال دی ہے — اور پھر سوکھے تالاب سے باہر والی دنیا سے نواب یار خاں کا کوئی تعلق بھی تو نہیں ہے — سوکھے تالاب میں بھوئی — بنجارے — گھسیارے اور اسی قسم کے دوسرے لوگ رہتے ہیں جنھیں نواب یار خاں کے ماضی سے کوئی سروکار نہیں ہے — وہ تو بس اتنا جانتے ہیں کہ چودھری اور نواب یار خاں یہ دونوں ہی اس علاقے کی اہم ترین شخصیتیں ہیں — سوکھے تالاب کے ہر قانونی، سماجی اور سیاسی معاملے کے فیصلے کا مکمل حق اسی دو رکنی عدالت کو حاصل ہے جس کے اختیارات لامحدود ہیں — اس علاقے کے اپنے قوانین ہیں — اپنے رواج ہیں — یہاں کے رہنے والے تہذیب کے سمندر میں ایک جزیرے کی حیثیت رکھتے ہیں — تمتمائے ہوئے چہروں اور گدرائے ہوئے جسموں والی عورتیں میلے، پھٹے پرانے کپڑے پہنے صبح سویرے چٹائیاں بنتی اپنے اپنے بچوں کو پیٹھ پر باندھے بھیک مانگنے نکل جاتی ہیں — مرد جرائم پیشہ ہیں — بار برداری بھی کرتے ہیں — شراب کی بھٹیاں بھی لگاتے ہیں — چوریاں بھی کرتے ہیں — دن بھر اپنے اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد سارے مرد عورت راتوں کو پی پلا کر گھر لوٹتے ہیں — راتوں میں دیر تک لڑائی جھگڑے کی آوازیں گونجتی رہتی ہیں — پھر آہستہ آہستہ عورتوں کی آوازیں سپردگی کے بوجھ سے دبتے دبتے سسکیوں میں بدل جاتی ہیں — رات کا سناٹا — آہستہ آہستہ چاروں طرف سے داخل ہوتا ہے اور ایک ایک چیز پر چھا جاتا ہے — فضا میں اب صرف سسکیاں ہیں — بالکل غیر محسوس سی — اور ان سسکیوں میں جو ہر طرف چھائے ہوئے اتھاہ سناٹے میں اس طرح تحلیل ہو جاتی ہیں جیسے پانی میں کوئی ہلکا سا رنگ — ان میں نواب صاحب کی بڑی بیگم کی سسکیاں بھی شامل ہیں جو آج سے برسہا برس پہلے نواب صاحب کے محل میں اپنی چھوٹی سی عمر میں داخل ہوئی تھیں — وہ خود بھی ایک نواب صاحب ہی کی بیٹی تھیں

انھوں نے زندگی کے ٹھاٹ باٹ دیکھے تھے ــــ پہلے میکے کے ــــ پھر سسرال کے ــ شادی کے بعد نواب صاحب نے ایک ماما کو گھر ڈال لیا تھا لیکن بڑی بیگم نے اسے کبھی سوت نہیں سمجھا ــ اور نہ اس ماما نے خود کو کبھی بیگم کے برابر سمجھنے کی کوشش کی ــــ ان دونوں کے درمیان وہی فاصلہ ہمیشہ باقی رہا جو بیگم اور ماما کے درمیان ہو سکتا تھا ــــ اور پھر وہ بانجھ بھی تھی ــــ بیگم کو اپنے بچوں کے لئے اس سے اچھی آیا بھی نہ مل سکتی تھی ــــ رہا رقابت کا معاملہ ــــ تو بیگم خود ایسے ماحول میں پروان چڑھی تھیں جہاں جذبات اگر مجروح ہوتے بھی ہیں تو تجارتی اور معاشی بنیادوں پر۔ چنانچہ بیگم صاحبہ کے جذبات اس لئے کبھی مجروح نہیں ہوئے کہ ان کے وقار ــ اور ان کی سطح کو دھکا نہیں لگا ــــ دن گذرتے گئے ــــ اچھے گذرے ــــ برے دن آئے ــــ اور پتہ نہیں کب نواب صاحب چپکے سے سوکھے تالاب میں آبسے ــ سنا ہے ان دنوں یہاں اتنی آبادی نہیں تھی ــــ اسی دوران میں نواب صاحب کے حرم میں دو کا اور اضافہ ہو چکا تھا ــــ نواب صاحب کی یہ دونوں جونیئر بیگمات تالاب کے باہر کسی محلے میں ماماؤں کے فرائض انجام دیا کرتی تھیں ــــ وقت کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کی لذتِ کام و دہن کا معیار بھی بدلا ــــ بڑھیا شراب کی جگہ تاڑی کے عوامی مشروب نے لے لی لیکن نواب صاحب کے دسترخوان پہ اب بھی تین علٰحدہ علٰحدہ قسم کی ڈشز چنی جاتی تھیں ــــ جن میں سے ایک کا تعلق خود ان کے گھر کے باورچی خانے سے ہوتا تھا ــــ دوسری دو وہ ہوتی تھیں جو ان کی بیگمات شام کو کام سے واپس لوٹتے وقت ساتھ لایا کرتی تھیں۔

نواب صاحب سے میری پہلی ملاقات رائل کے قریب ہوئی تھی۔ وہ غالباً سٹے کا فگر کھیل کے لوٹ رہے تھے ــــ ان کے چہرے پر وہی احمقانہ تازگی تھی جو سٹے بازوں کے چہروں پر اس وقت آجاتی ہے جب انھیں فگر کے لگ جانے کا پورا یقین ہوتا ہے ــــ نواب صاحب اپنے عجیب وغریب میوزیمی حلیہ کے ساتھ بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی ایک صحت مند "سکرٹ" کو دیکھتے ہوئے مجھ سے ٹکرا گئے اور ان کی میلی دو پلی اُڑ کے بس اسٹینڈ کے عین سامنے بہنے والی نالی میں

جا پڑی جس میں بارہوں مہینے گندہ پانی بھرا رہتا ہے۔

"یعنی — آ — آپ بھی عجیب نالا —"

نواب صاحب نے جن کے ہونٹوں پر مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی وسیع دعریض موچھوں کے سخت — کھردرے اور بدرنگ بال غصّہ میں اور بھی سخت ہوگئے تھے۔ مجھے گالی دینے کی کوشش کی لیکن رک گئے — میں نے اپنے چہرے پر آئی ہوئی بے ساختہ مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کی۔

"جی — نالائق — میں نہیں ہوں — وہ — ٹانگیں ہیں!!"

میں نے بس کے انتظار میں بے چین ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا جو اُلٹے گلدروں کی طرح دو اونچی ایڑیوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔

اچانک — غیر متوقع طور پر موچھوں کے سائے تلے — مسکراہٹ کی روشنی سی پیدا ہوئی لیکن پھر ایک ہی لمحے میں غائب ہوگئی — نواب صاحب کے دونوں ہاتھ ننگے سر پر گئے — دوپلّی ٹوٹے ہوئے جہاز کی طرح نالی میں ڈوب چکی تھی — پھر وہ بغیر کچھ سُنے آگے بڑھ گئے لیکن ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ننگے سر رہنے کی عادت نہیں تھی — بار بار انھوں نے جیب میں کچھ ٹٹولا۔ اور سامنے پان کی دوکان میں لٹکی ہوئی دوپلیوں کی طرف جھنجلا کے دیکھا پھر انتہائی مظلومیت سے جیب میں سے میلی دستی نکالی اور سر پر باندھ لی — میں نے لپک کر ایک دوپلّی خریدلی۔

"سُنئے —" میں نے آگے بڑھ کے انھیں پکارا۔ "میں اپنی غلطی پر نادم ہوں — یہ میری طرف سے قبول فرمائیے —" میں نے کہا اور دوپلّی آگے بڑھائی — لیکن موچھیں مارے غصّہ کے اکڑ گئیں۔

"جی — میں ڈنڈ نہیں لیتا —"

انھوں کے یوپی کے لہجے میں حیدرآبادی 'ڈنڈ' کا پیوند لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں — یہ ڈنڈ نہیں ہے — اسے ایک حقیر ساتحفہ سمجھیے۔"

ان کے چہرے پر مزید ناگواری کے اثرات نمایاں ہوتے ہوئے دیکھ کر میں نے جلدی سے کہا۔

"اگر آپ اسے قبول نہ فرمائیں گے تو میں شرمندگی سے اپنا دامن نہیں چھڑا سکوں گا۔"

یہ حربہ کارگر ثابت ہوا ـــــ اور نواب صاحب نے نئی دوپلّی اپنے سر پر منڈھ لی۔

اس واقعہ کو کئی دن گذر چکے تھے ـــــ ایک رات پڑوس میں گڑبڑ کی وجہ سے میری آنکھ کھُل گئی ـــــ پتہ چلا چوری ہو گئی ہے ـــــ میں نے اپنے پڑوسی کے ساتھ جا کے تھانے میں رپورٹ کی ـــــ صبح تک پولیس نے پتہ لگایا کہ چوری ایک گھسیارے نے کی تھی جو سوکھے تالاب میں رہتا تھا ـــــ میں بھاگا بھاگا سوکھے تالاب کو پہنچا۔ پولیس کی جیپ آبادی کے باہر ہی کھڑی تھی اور جھونپڑیوں کی بستی میں ایک نسبتاً ممتاز مکان کے آگے کافی مجمع تھا ـــــ پولیس والے لوگوں کو گھر میں جانے سے روکے ہوئے تھے ـــــ مجھے انسپکٹر دروازے میں نظر آیا۔ اس کے قریب پہنچنے پر یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ کمرے میں میلا کچیلا فرش بچھا ہوا ہے اور دیوار کے قریب پھٹے پرانے گاؤ تکئے سے پیٹھ لگائے وہی موچھیں بیٹھی ہوئی ہیں جن سے اس دن بس اسٹاپ پر ٹکراؤ ہوا تھا ـــــ سر پہ دوپلّی آن بان سے رکھی ہوئی تھی ـــــ فرش کے قریب حقّہ رکھا ہوا تھا جس کا نیچہ جگہ جگہ سے ٹوٹا ہوا تھا اور اس پر دھجیاں لپٹی ہوئی تھیں اور ایک معصوم صورت سیاہ فام گھسیارا ان کے پیر پکڑے گڑگڑا رہا تھا۔

یہ پہلی مرتبہ تھی کہ مجھے نواب صاحب سے باقاعدہ تعارف کا موقعہ ملا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے

"آئیے آئیے ـــــ آپ کیسے تشریف لے آئے ؟"

انھوں نے انتہائی گرم جوشی سے چلّا کر کہا ـــــ اور جب میں نے انھیں بتایا کہ میں اس غریب کا پڑوسی ہوں جس کے گھر چوری ہوئی ہے تو انھوں نے بڑی قہر آلود نگاہوں سے اسی گھسیارے کی طرف گھورا جو پیر چھوڑ کے بڑی گھبرائی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھنے لگا تھا۔

نواب صاحب نے الگ لے جا کر انسپکٹر سے سفارش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ مال مسروقہ برآمد ہو چکا تھا ـــــ انسپکٹر نے کہا "میں کچھ نہیں کر سکتا"۔

پولیس گھسیارے کو ساتھ لے گئی ـــــ اور نواب صاحب ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح لوٹ کے تکئے پر گر پڑے ـــــ ایک اور شخص بھی پگڑی باندھے چپ چاپ چھت کو گھور رہا تھا ـــــ یہ چودھری تھا۔

سوکھے تالاب کی قضا و قدر کی مالک اس دو کَمّی عدالت کو آج شائد پہلی مرتبہ مجبور ہو جانا پڑا تھا ـــــ اسے پہلی مرتبہ اپنی رعایا کے آگے نیچا دیکھنا پڑا تھا۔

بہر حال نواب صاحب نے چائے سے میری تواضع کی اور پھر میں گھر چلا آیا۔

مجھے نواب صاحب کی اس عجیب و غریب شخصیت سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ میں اس کے بعد بھی کئی مرتبہ سوکھے تالاب کو خاص طور پر نواب صاحب سے ملنے کے لئے گیا ـــــ اور وہ ہر مرتبہ بڑی خوش اخلاقی سے پیش آئے ـــــ مجھے یہ دیکھ کر بڑا لطف آتا تھا کہ نواب صاحب نے کچھ عجیب ٹوٹا پھوٹا سا نوابی ماحول پیدا کرنے کی کوشش کی تھی ـــــ ان کے دیوان خانے میں جھانکئے تو یوں لگتا تھا جیسے کسی بڑی مفلس اور چھوٹی سی تھیئٹر کمپنی کے اسٹیج کئے ہوئے کسی ڈرامے کا جاگیر دار گھرانے والا ایک سین دیکھ رہے ہوں ـــــ نواب صاحب کی دونوں بیگمات کی تنخواہوں کے علاوہ ان کے گھر کے اخراجات کس طرح چلتے تھے یہ بات کم از کم میرے لئے تو ایک راز ہی رہی ـــــ جسے زیادہ کریدنے کی میں نے ضرورت بھی نہیں سمجھی۔

ایک مرتبہ عجیب اتفاق ہوا ـــــ میں دو تین دن کے لئے باہر گیا ہوا گیا ہوا تھا ـــــ واپس پہنچا تو بستر پر سے چادر اور ہینگرز پر سے سارے کپڑے غائب تھے ـــــ میں حیران رہ گیا ـــــ حمام کا دروازہ کھلا تھا، میں سمجھ گیا کہ چور اسی دروازے سے داخل ہوا ہوگا ـــــ چرائے ہوئے کپڑے

اتنے زیادہ قیمتی نہیں تھے۔ دو تین قمیص — دو ایک بنیان — دو پاجامے — اور ایک چادر۔ اس لئے میں نے پولیس کو اطلاع دے کے طویل کارروائی کو بھگتنا مناسب نہیں سمجھا — بات آئی گئی ہو گئی — کسی نے مجھے بتایا کہ جن دنوں میں باہر گیا ہوا تھا — سوکھے تالاب کا ایک گھسیارا مشکوک حالات میں میرے گھر کے پچھواڑے دیکھا گیا تھا — میں نے سوچا لگے ہاتھ تحقیقات کر دیکھی جائے — چنانچہ اوّلین فرصت میں نواب صاحب کے گھر پہنچا۔

"نواب صاحب"

میں نے آہستہ سے آواز دی۔

دروازہ کھلا — دو آنکھوں نے لمحہ بھر کو میرا جائزہ لیا اور پھر چلمن کانپی۔

"اَخاہ — آپ ہیں — آئیے آئیے۔"

نواب صاحب مع اپنی خوش اخلاقی اور ہمہ وقتی دوپلّی کے ساتھ چلمن کے عقب سے طلوع ہوئے اور مجھے گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے۔

"ارے میاں — کہاں رہے اتنے دنوں؟"

انھوں نے پوچھا۔

"ذرا دورے پہ گیا ہوا تھا نواب صاحب۔"

میں نے انھیں بتایا۔

"اچھا اچھا — خیر بیٹھو — میں ابھی آیا۔"

انھوں نے حسب معمول میری تواضع کا بندوبست شروع کر دیا — اور میں پھٹے ہوئے گاؤتکیے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا — لیکن اچانک یوں محسوس ہوا جیسے بچھو نے ڈنک مار دیا ہو — اور میں — ایک دم سیدھا ہو کے بیٹھ گیا۔

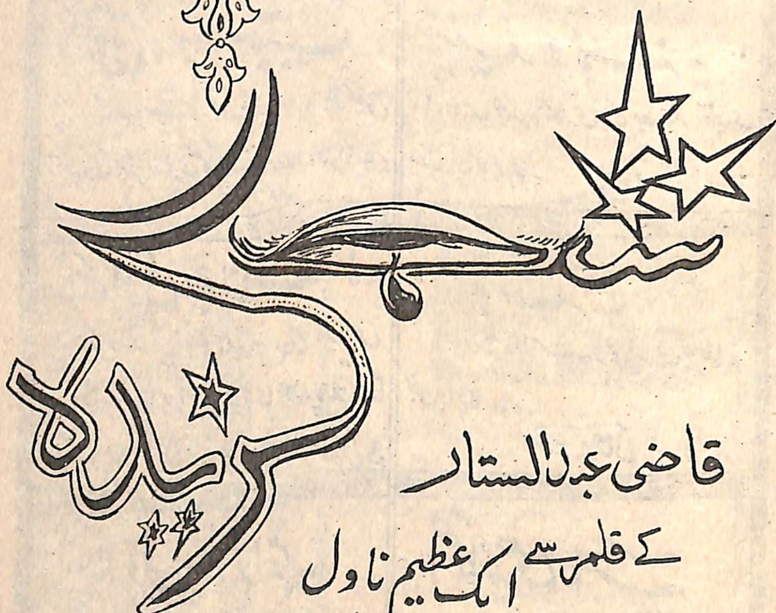
فرش پر بچھی ہوئی چادر کا کونا میرے پیر سے اُلٹ گیا تھا اور اس پہ میرے نام کا پہلا حرف چمک رہا تھا !!

اودھ کی حویلیوں کی

رنگین و پُرجلال

داستان

مکتبہ فسانہ کی پیشکش



قاضی عبدالستار

کے قلم سے
ایک عظیم ناول

ضخامت تقریباً ۱۳۰ صفحات

قیمت ۳ روپیے ۷۵ پیسے

مکتبہ فسانہ عثمانی منزل دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

نادر کتب

نکاتِ مجنوں

تنقیدی حاشیے اور کچھ نئے مضامین 5/-

مجنوں گورکھپوری

تحقیق و تنقید

کچھ نئے مضامین اور "تنقید جدید" اور "تحقیق و تنقید" کے بیشتر مضامین کا یکجا ایڈیشن۔ اختر اورینوی

3/75

تنقید و تجزیہ

اردو میں قصیدہ نگاری کے بعد دس تنقیدی مضامین کا مجموعہ۔

ابو محمد سحر 3/-

نئے ادبی رجحانات!

ترمیم شدہ پانچواں ایڈیشن جس میں اس بار دو نئے مضامین "پیروڈی اور رپوتاژ" کا اضافہ کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر اعجاز حسین 3/75

ضدی

عصمت کا مشہور ناولٹ جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔

عصمت چغتائی 2/50

چار دل چار راہیں

خواجہ احمد عباس کا پہلا ناول جو فلمایا بھی جا چکا ہے۔

خواجہ احمد عباس 3/50

گاندھی نامہ

چار جلدوں پر مشتمل کلیاتِ اکبر کے بعد یہ پانچواں مجموعہ۔

اکبر الہ آبادی 2/50

کتابستان الہ آباد ۲

Collection of Shobhit Mahajan. Courtesy Sarai.

شودھی چھوٹی ہڑیں
پیٹ کی جملہ شکایت کے لیے

عرق انگور مرکب
دماغی وجسمانی کمزوریوں کے لیے

بال امرت گھٹی
دودھ پیتے بچوں کے دودھ ہضم کرنے کے لیے

کرشن کا بال امرت
بچوں کی میٹھی پشٹی!

لال تیل
بچوں کے سوکھا ومتھوا روگوں میں ملنے کے لیے

۱۸۸۷ء سے

مشہور

قابلِ اعتماد

اور

ممتاز دواخانہ

جہاں تمام دوائیں اعلیٰ قسم کی تروتازہ اور خالص جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہیں جنھیں بچے بوڑھے و جوان ہر عمر کے لوگ بغیر کسی خوف کے پورے اعتماد کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں آپ بھی اپنی تکلیفوں کو دور کرنے اور مکمل صحت پانے کیلئے مندرجہ ذیل پتہ سے دوائیں منگائیں اور استعمال کریں۔

حکیم رام کشن لال
یونانی میڈیکل ہال، رانی منڈی الہ آباد


اعتماد کا نشان

Collection of Shobhit Mahajan. Courtesy Sarai.


J.B. MANGHARAM'S
Salto
Biscuits
سفر میں
بڑا ہی
مزا آئیگا
چنیدہ طاقت سے بھرپور
اجزا سے بنائی ہوئی
جے۔ بی۔ منگھارام کی
مٹھائیاں اور بسکٹ آپ کے
سفر میں بے حد دلکشی اور مزا پیدا کریں گے
جے۔ بی۔ منگھارام کے
بسکٹ
لگ بھگ سبھی
ریسٹورنٹ
اور کینٹین بیچتے ہیں
جے۔ بی۔
منگھارام اینڈ کمپنی
گوالیار، حیدرآباد

